تحصیلِ صدقات پر کمیشن کا حکم

مفتی محمد نظام الدین رضوی برکاتی

مکتبہ برہانِ ملت
اشرفیہ، مبارکپور، اعظم گڑھ، یو،پی

محمد عبد الرحمٰن حبیبی بھدوہی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا

صدقات فقرا و مساکین اور (اسے وصول کرنے والے) عاملین کے لیے ہے۔ (۶۰/التوبہ، ۹)

تحصیل صدقات پر کمیشن کا حکم

★ زکوٰۃ اور چندہ وصول کرنے والوں کی شرعی حیثیت کیا ھے★ ان کی اجرت اور کمیشن فقه کے کس باب اور کس عقد سے متعلق ھے★ان کی وصول کردہ رقم کی حقیقت شرعیه کیا ھے★اور اس میں ان کا نجی تصرف جائز ھے یا نھیں ★ کمیشن کتنی مقدار میں دیا جا سکتا ھے ★ اور بھر حال اس باب میں بھتر کیا ھے؟ ان تمام مسائل کی تحقیق و تشریح۔

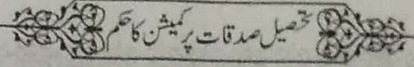
...... تصنیف ......

مفتی محمد نظام الدین رضوی برکاتی

صدر شعبۂ افتا، جامعه اشرفیه، مبارک پور

...... ناشر ......

مکتبہ برہانِ ملت، اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ (یو۔ پی۔)



باسمہٖ سبحانہ و تعالیٰ و تقدس

نام کتاب : تحصیل صدقات پر کمیشن کا شرعی حکم

تصنیف : مفتی محمد نظام الدین رضوی برکاتی

موضوع : مصارف زکوٰۃ

صفحات : ۶۴

تعداد : ۱۱۰۰ (گیارہ سو)

طبع اول : صفر المظفر ۱۴۳۰ھ/فروری ۲۰۰۹ء

کمپوزنگ : مہتاب پیامی، پیامی کمپوٹر گرافکس، مبارک پور-9336741245

پروف ریڈنگ: جناب مولانا ساجد علی صاحب دام مجدہم، استاذ جامعہ اشرفیہ

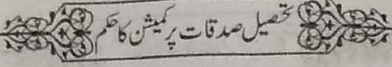
ناشر : مکتبہ برہانِ ملت، اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ (یو. پی.)

ھدیۂ تشکر

(۱) اس کتاب کی اشاعت میں ایک علم دوست عالی جناب محترم محمد حنیف کھنانی صاحب دام مجدہم نے مخلصانہ تعاون فرمایا۔ ادارہ اس کے لیے ان کا خلوصِ قلب کے ساتھ شکر گزار ہے۔ خدائے بزرگ و برتر انھیں دارین میں اس کا بہتر صلہ عطا فرمائے، ان کی خدمات دینیہ کو قبول فرمائے اور حوادثِ دہر سے محفوظ و مامون رکھے اور انھیں برکاتِ دین و دنیا سے نوازے۔ آمین بجاہ حبیبہ النبی الامین علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم۔

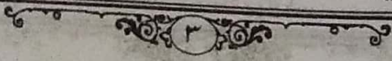
(۲) اس کتاب میں شامل بیش تر عربی عبارات کا ترجمہ محبّ مکرم جناب مولانا ساجد علی مصباحی دام مجدہم استاذ جامعہ اشرفیہ نے کیا ہے، جس کی نشان دہی ہر ترجمہ کے اخیر میں (م.ساجد) سے کی گئی ہے، نیز کمپوزنگ کی پروف ریڈنگ فرمائی ہے، ہم اس کے لیے مولانا موصوف کے شکر گزار ہیں۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔ **(ادارہ مکتبہ برہانِ ملت)**





باسمہٖ سبحانہ و تعالیٰ و تقدس

آئینۂ کتاب



باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

سوال نامہ مولانا شکر اللہ صاحب دام مجدہم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ:

آج کل مدارس اسلامیہ کے سفرا جو طے کر کے چندہ کرتے ہیں، مثلاً اس میں کبھی ۴۰ر فی صد کبھی ۵۰ر فی صد لیتے ہیں۔ اور یہی رائج ہے کیوں کہ مہتمم حضرات بخوشی دیتے ہیں۔ اب دریافت یہ ہے کہ آیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

نیز اگر بغیر طے کیے بعد وصولی مہتمم حضرات اپنی مرضی سے کچھ دے دیں تو اس کا کیا حکم ہے؟

واضح رہے کہ سیدنا حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ اپنے فتویٰ محررہ ۱۸ر محرم الحرام ۱۳۸۹ھ میں بہر صورت عدم جواز کے قائل ہیں۔ حالاں کہ عدم جواز کی صورت میں ایک دینی کام رک جائے گا۔ مذہبی اداروں کا چلنا دشوار ہو جائے گا اور تحصیل علم کا دروازہ بند ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ جب کہ یہی وجہ ہے کہ زکاۃ وغیرہ کی رقمیں تعمیر مدرسہ وتنخواہ مدرسین میں بعد حیلہ خرچ کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ صدر الشریعہ علیہ الرحمہ فتاویٰ امجدیہ جلد اول ص: ۳۷۶ر پر تحریر فرماتے ہیں:

> ”صدقۂ فطر وزکاۃ نہ تعمیر مدرسہ میں صرف کی جا سکتی ہے، نہ تنخواہ مدرسین میں مگر اس قسم کی مدوں کو نکال دیا جائے تو مدرسہ کی آمدنی اس زمانے میں اتنی کم رہ جائے گی جس سے اس کا چلنا دشوار ہو جائے گا اور تحصیل علم کا دروازہ بند ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ لہٰذا ان چیزوں میں زکاۃ اور صدقۂ فطر بطور حیلہ کے صرف کیا جائے کہ اس قسم کے امور خیر کے لیے حیلہ کرنے میں کسی قسم کی کراہت وقباحت نہیں۔“

کیا وجہ ہے کہ محصلین کو کچھ متعینہ یا غیر متعینہ رقم بعد حیلہ نہ دی جائے کہ علم کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔

المستفتی

محمد شکر اللہ خاں قادری

مقام وپوسٹ جمدا شاہی، ضلع بستی (یو. پی.)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ ☆ والصّلاۃ والسّلام علیٰ عبادہٖ الّذین اصطفیٰ ☆ وحبیبہٖ اجتبیٰ، وعلیٰ اٰلہٖ وصحبہٖ نجوم الھدیٰ ☆ وکُلّ من اھتدیٰ ☆

سفرا ومحصلین کے ذریعہ زکاۃ وصدقات اور عطیات کی وصولی پر جو معاوضہ دیا جاتا ہے، وہ شرعی نقطۂ نظر سے اجرت ہے اور مدارس وسفرا کے درمیان اس کے لیے جو معاہدہ ہوتا ہے وہ عقد اجارہ ہے۔ کیوں کہ اجارے میں:

(۱) یا تو کسی کے مکان، دوکان، زمین، سامان وغیرہ سے نفع اٹھانے کا کرایہ دیا جاتا ہے۔

(۲) یا کوئی کام کرنے، کرانے پر مزدوری دی جاتی ہے ــــ اور دونوں پر ہی اجارے کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں چندہ کرنے پر سفیر کو مزدوری دی جاتی ہے، اس لیے یہ بھی اجارہ ہوا، یہ الگ بات ہے کہ یہ اجارہ کی نوع دوم سے ہے۔

فتاویٰ ہندیہ کتاب الاجارۃ میں ہے:

”انھا نوعان، نوعٌ: یرد علی منافع الأعیان کاستئجار الدّور والأراضی والدّوابّ وما أشبہ ذلك.

اجارہ کی دو قسمیں ہیں: **ایک**: وہ اجارہ جو چیزوں سے نفع اٹھانے کا ہوتا ہے۔ جیسے مکان، زمین، چوپایے اور ان جیسی دوسری چیزوں کو کرایے پر لینا۔

ونوع: یرد علی العمل کاستئجار المحترفین للأعمال کالقصارۃ والخیاطۃ والکتابۃ وما أشبہ ذلك. کذا فی المحیط.“ (۱)

دوسرے: وہ اجارہ جو کام کرنے کا ہوتا ہے۔ جیسے دُھلائی، سلائی، کتابت اور ان جیسے دوسرے کاموں کے پیشہ وروں کو اجرت پر رکھنا۔ ایسا ہی ”محیط“ میں ہے۔ (م ساجد)

ہدایہ میں ہے:

(۱) الفتاویٰ الھندیہ، ص: ۴۱۱، ج: ۴، الباب لأول فی تفسیر الاجارۃ وبیان انواعھا.

"وربما يقال: الاجارة قديكون عقدًا على العمل كاستئجار القصار والخياط، ولابدأن يكون العمل معلومًا، وذلك في الأجير المشترك وقديكون عقدًا على المنفعة كما في أجير الوَحْدِ. ولابدّ من بيان الوقت اه." (۱)

اجارہ کی تقسیم اس طرح بھی کی جاتی ہے کہ اجارہ کبھی عمل (کام) کا ہوتا ہے۔ جیسے دھوبی اور درزی کو اجرت پر رکھنا۔ اس اجارہ میں عمل کا معلوم ہونا ضروری ہے۔ اور یہ صورت "اجیر مشترک" میں ہوتی ہے۔ اور اجارہ کبھی منفعت کا ہوتا ہے۔ یہ صورت "اجیر خاص" میں ہوتی ہے۔ اس میں وقت کا بیان ضروری ہے۔ (م ساجد)

کسی عوض پر کام کرنے والے کو "اجیر" اور عوض کو "اجرت" کہا جاتا ہے۔ فتاویٰ رضویہ، بہار شریعت اور دوسری کتب فقہ میں بھی ایسا ہی ہے۔

اجیر دو طرح کے ہوتے ہیں:

ایک: تو وہ جو کسی خاص فرد، فرم یا ادارے کا پابند ہوتا ہے اور اس کے لیے ڈیوٹی کا وقت بھی مقرر ہوتا ہے کہ یہ اس وقت میں دوسرے کا کام نہیں کرسکتا۔ اسے عام بول چال میں "تنخواہ دار ملازم" کہتے ہیں اور عرف شرع میں اسے "اجیر خاص" کہا جاتا ہے۔ یعنی خاص شخص کا مزدور جس سے ڈیوٹی کے وقت میں بس وہی کام لے سکتا ہے۔

دوسرا: وہ اجیر جو کسی ایک فرد، فرم یا ادارے کا پابند نہیں ہوتا کہ کسی وقت مقرر میں یہ اسی کا کام کرے، بلکہ اسے دوسرے کا کام کرنے کا بھی اختیار ہوتا ہے۔ یہ کام کرنے کے حساب سے مزدوری پاتا ہے کہ جتنا کام کرے گا، اسی کے حساب سے مزدوری پائے گا۔ کام زیادہ ہوگا تو مزدوری بھی زیادہ ہوگی اور کام کم ہوگا تو مزدوری بھی کم ہوگی۔ جیسے درزی، دھوبی، حجام، کاتب، ملاح، دلال، کمیشن ایجنٹ وغیرہ اسی

(۱) ھدایہ، ج:۳، ص:۲۷۸، کتاب الإجارات قُبیل "بابُ الاجر متیٰ یُستحقُّ" مجلس برکات

طرح کے اجیر یا مزدور ہیں۔ ایسے اجیر کو فقہ کی اصطلاح میں "اجیر مشترک" کہا جاتا ہے کہ وہ بہ طور اشتراک سب کا مزدور ہو سکتا ہے، جو چاہے اس سے کام کرا لے۔

یہ صرف کام کرنے پر اجرت کا حق دار ہوتا ہے جب کہ اجیر خاص کام نہ ہونے کی صورت میں صرف ڈیوٹی پر حاضر رہنے کے سبب بھی اجرت کا حق دار ہوتا ہے۔

درمختار میں ہے:

"الأجراء على ضربين: مشترك وخاص **فالاول:** من يعمل لالواحد كالخياط ونحوه أويعمل له عملاً غير موقت كان استاجره للخياطة في بيته غير مقيّدة بمدة كان أجيراً مشتركًا وان لم يعمل لغيره ...... ولا يستحق المشترك الأجر حتى يعمل كالقصار ونحوه كفتال وحمال ودلال وملاح ...... **والثاني:** وهو الأجير الخاص، ويسمى "أجير واحد" وهو من يعمل لواحدٍ عملاً موقتًا بالتخصيص ويستحق الأجر بتسليم نفسه في المدة وان لم يعمل كمن استوجر شهرًا للخدمة أوشهرًا

اجیر دو قسم کے ہیں: مشترک اور خاص۔ "**اجیر مشترک**" وہ ہے جو ایک ہی شخص کے لیے کام نہ کرے۔ جیسے درزی وغیرہ یا ایک ہی شخص کے لیے کام کرے لیکن اس کام میں وقت کی پابندی نہ ہو مثلاً۔ کوئی درزی کو کپڑا سینے کے لیے اپنے گھر رکھے اور اس کے لیے وقت کی پابندی نہ ہو تو وہ "اجیر مشترک" ہے اگرچہ دوسرے کا کام نہ کرے ......

اجیر مشترک کام پورا کر لینے کے بعد ہی اجرت کا حق دار ہوگا۔ جیسے دھوبی، رسی بٹنے والا، قلی، دلال اور ملاح وغیرہ۔

دوسری قسم: "**اجیر خاص**" ہے۔ اس کو "**اجیر واحد**" بھی کہتے ہیں۔ یہ وہ اجیر ہے جو ایک شخص کا کام کرے اور اس میں خاص وقت کا پابند ہو۔ یہ مقررہ وقت میں کام کے لیے حاضر رہنے سے اجرت کا مستحق ہو جاتا ہے اگرچہ (کام نہ ملنے کی وجہ سے) کام نہ کرے۔ جیسے وہ شخص جسے ایک ماہ خدمت

لرعی الغنم المسمی بأجر مسمی. اھ." (۱)

کرنے یا متعین بکریاں چرانے کے لیے متعین اجرت کے بدلے مزدور رکھا گیا۔ (م۔ساجد)

یہی تفصیلات ہدایہ میں بھی ہیں۔ عبارت یہ ہے:

الأجراءُ علىٰ ضربين: أجير مشترك وأجير خاص.

فالمشترک من لا يستحق الأجرة حتى يعمل كالصبّاغ والقصّار. لأن المعقود عليه اذا كان هو العمل أو أثره كان له أن يعمل للعامة لأن منافعه لم تصر مستحقة لواحدٍ فمن هذا الوجه يسمى أجيراً مشتركًا.

قال: **والأجير الخاص**: الذى يستحق الأجرة بتسليم نفسه فى المدة وان لم يعمل كمن استوجر شهرًا للخدمة أولرعى الغنم وانما سمّى أجير وحد لأنه لايمكنه أن يعمل لغيره لأن منافعه فى المدة صارت مستحَقة له والأجر مقابل بالمنافع ولهذا يبقى

اجیر دو قسم کے ہیں: اجیر مشترک اور اجیر خاص۔ **اجیر مشترک** وہ ہے جو کام پورا کرنے کے بعد ہی اجرت کا حق دار ہوتا ہے۔ جیسے رنگ ریز اور دھوبی۔ اجارہ اگر عمل (مثلاً کپڑا دھلنے) یا اس کے اثر (مثلاً کپڑا رنگنے) کا ہو تو اجیر کے لیے ہر کسی کا کام کرنا جائز ہے کیوں کہ اس صورت میں اس کے کام کا حق دار کوئی ایک فرد نہیں ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو "اجیر مشترک" کہا جاتا ہے۔

امام قدوری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: **اجیر خاص** وہ ہے جو مقررہ وقت میں کام کے لیے حاضر رہنے سے اجرت کا حق دار ہو جاتا ہے اگرچہ (کام نہ ملنے کی وجہ سے) کام نہ کرے۔ جیسے وہ شخص جسے ایک ماہ خدمت کرنے یا بکریاں چرانے کے لیے اجیر رکھا گیا۔ اسے "اجیر واحد" بھی کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ (مقررہ وقت میں) دوسرے کا کام نہیں کر سکتا کیوں کہ اس وقت میں اس کے کام کا حق دار کام پر رکھنے والا ہوتا ہے اور اجرت کام کا ہی بدل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

(۱) در مختار، ص:۸۷-۹۵، ج:۹، باب ضمان الأجير.

الأجر مستحَقًا وان نقض العمل. اھ." (۱)

اجیر خاص اجرت کا حق دار رہتا ہے اگرچہ اس کا کام ختم کر دیا جائے۔ (م۔ساجد)

بہار شریعت میں ان جزئیات کی ترجمانی ان الفاظ میں ہے:

"اجیر دو قسم کے ہیں: اجیر مشترک و اجیر خاص۔ **اجیر مشترک**: وہ ہے جس کے لیے کسی وقت خاص میں ایک ہی شخص کا کام کرنا ضروری نہ ہو، اس وقت میں دوسرے کا بھی کام کر سکتا ہو۔ جیسے دھوبی، خیاط، حجام، حمال وغیرہم جو ایک شخص کے کام کے پابند نہیں ہیں اور **اجیر خاص**: ایک ہی شخص کا پابند ہوتا ہے۔"

مسئلہ: کام میں جب وقت کی قید نہ ہو، اگرچہ وہ ایک ہی شخص کا کام کرے، یہ بھی اجیر مشترک ہے۔ مثلاً درزی کو اپنے گھر میں کپڑے سینے کے لیے رکھا اور یہ پابندی نہ ہو کہ فلاں وقت سے فلاں وقت تک سئے گا اور روزانہ یا ماہوار یہ اجرت دی جائے گی۔ بلکہ جتنا کام کرے گا اسی حساب سے اجرت دی جائے گی، تو یہ اجیر مشترک ہے۔

یوں ہی اگر وقت کی پابندی ہے مگر دوسرے کا بھی اس وقت میں کام کرنے کی اجازت ہے۔ مثلاً چرواہے کو بکریاں چرانے کو ایک روپیہ ماہوار پر رکھا مگر یہ نہیں کہا ہے کہ دوسرے کی بکریاں نہ چرانا، تو یہ بھی اجیر مشترک ہے۔ اور اگر یہ طے ہو جائے کہ دوسرے کی بکریاں نہیں چرائے گا تو اجیر خاص ہے۔

مسئلہ: اجیر مشترک میں اجارہ کا تعلق کام سے ہے۔ لہذا وہ متعدد اشخاص کے کام لے سکتا ہے اور اجیر خاص میں اس مدت کے منافع کا ایک شخص کو مالک کر چکا، لہذا دوسرے سے عقد نہیں کر سکتا۔

مسئلہ: اجیر مشترک اجرت کا اس وقت مستحق ہے جب کام کر چکے۔ مثلاً درزی نے کپڑے کے سینے میں سارا وقت صرف کر دیا مگر کپڑا سی کر تیار نہ کیا یا اپنے مکان پر سینے کے لیے تم نے اسے مقرر کیا تھا، دن بھر تمہارے یہاں رہا مگر کپڑا نہیں سیا۔

(۱) هداية باب ضمان الأجير ص:۲۹۲-۲۹۴، ج:۳، مجلس بركات.

اجرت کا مستحق نہیں ہے۔ (۱)

حاشیہ فتاویٰ رضویہ میں ہے:

جس اجیر کا وقت مول لیا، مثلاً اتنے ماہوار پر خدمت گار، وہ اجیر خاص کہلاتا ہے۔ وہ اس وقت میں دوسرے کا کام نہیں کرسکتا اور اس کی تنخواہ کام پر موقوف نہیں۔ اگر اس نے وقت دیا اور اسے کام نہ ملا، خالی بیٹھا رہا، تنخواہ پائے گا۔ (۲)

ان جزئیات کو سامنے رکھ کر سفرا و محصلین کے طریق کار کا جائزہ لیجیے تو عیاں ہوگا کہ دونوں ہی طرح کے محصلین مدارس کے لیے چندہ کرتے ہیں، اجیر خاص بھی اور اجیر مشترک بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کل کے محصلین عام طور پر اجیر مشترک ہوتے ہیں۔ مگر اجیر خاص بھی پائے جاتے ہیں جو زیادہ تر اپنے مدرسہ کے قرب وجوار میں رہ کر چندہ کرتے ہیں۔

اگر اسی طرح کے سفرا دور دراز کے علاقوں میں بھی چندہ کے لیے بھیجے جاتے تو کسی کو اس کے جواز میں تردد نہ ہوتا کہ اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں پائی جاتی ہے اور اس کے جواز میں کسی کا اختلاف بھی نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے محصلین مدرسہ کے تنخواہ دار ملازم ہوتے ہیں تو جو حکم اساتذہ اور دیگر ملازمین کا ہے وہی حکم ان سفرا کا بھی ہوگا۔

اور جو سفرا کمیشن پر چندہ کرتے ہیں وہ فقہی اصطلاح کے مطابق ''اجیر مشترک'' ہوتے ہیں کیوں کہ فقہا نے اجیر مشترک کے جو اوصاف بیان فرمائے ہیں وہ سب اس میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی:

(الف) اس کے لیے ڈیوٹی کا کوئی وقت مقرر نہیں کہ خاص اس وقت میں کام پر نہ آئے تو غیر حاضر سمجھا جائے گا اور اس کے باعث اجرت کا حق دار نہ ہوگا۔

(ب) وہ کسی ایک کا پابند نہیں کہ وہ کسی وقت خاص میں اسی کا کام کرنے پر

(۱) بہار شریعت، حصہ:۱۴، ص:۱۴۴–۱۴۵، بحوالہ در مختار.

(۲) فتاویٰ رضویہ، ص:۴۲۴، ج:۱.

مجبور ہو اور دوسرے کا کام نہ کرسکے، بلکہ وہ دوسرے کا بھی کام کرسکتا ہے۔

(ج) وہ کسی بھی حال میں صرف ڈیوٹی پر حاضری کی وجہ سے اجرت کا حق دار نہیں ہوتا، بلکہ صرف کام کرنے پر اجرت کا حق دار ہوتا ہے۔ وہ بھی جتنا کام اتنا دام۔

اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ والرضوان نے ڈاک خانہ کو ''اجیر مشترک کی دوکان'' کہا ہے کیوں کہ اس میں یہ سارے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ لہذا اجیر مشترک قرار پائیں گے اور شرعاً اجارہ مطلقاً جائز ہے۔ خواہ کام کرنے والا اجیر خاص ہو یا اجیر مشترک کہ احادیث نبویہ اس باب میں مطلق وارد ہیں۔ جیسا کہ ہدایہ کتاب الاجارات کے درج ذیل اقتباس سے عیاں ہے:

انا جوزناه لحاجة الناس اليه وقد شهدت بصحتها الآثار وهي قوله عليه الصلوة والسلام: "اعطوا الأجير أجره قبل ان يجف عرقه" وقوله عليه السلام: "من استأجر أجيراً فليعلمه أجره" (۱)

ہم نے اجارہ کو اس لیے جائز قرار دیا کہ لوگوں کو اس کی حاجت ہے اور احادیث نبویہ بھی اس کی صحت کی شاہد ہیں۔ مثلاً حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اجیر کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اجرت دے دو۔ نیز ارشاد رسالت ہے کہ جو کوئی کسی کو اجیر رکھے تو اسے اس کی اجرت بتادے۔

اس لیے محصلین کا یہ اجارہ جائز ہونا چاہیے۔

مگر اجارہ بھی بیع کی طرح شروط فاسدہ سے فاسد ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ فقہائے کرام نے کتاب الاجارات میں اس کی صراحت فرمائی ہے۔ اور مسئلہ دائرہ اجارہ فاسدہ کی ایک شق ''قفیز طحان'' کے فساد کے دائرے میں آتا ہے۔ اس لیے اسے ناجائز ہونا چاہیے۔

قفیز ایک عربی پیمانے کا نام ہے جو بارہ صاع کا ہوتا تھا۔ ایک صاع کا وزن

(۱) هدايه كتاب الاجارات، ص:۲۷۷، ج:۳. مجلس بركات.

چار کلو چورانوے گرام۔ تو بارہ صاع کا ۴۹ر کلو ۱۲۸ر گرام۔ غیاث اللغات میں ہے:

''قفیز بہ فتح اول وکسر ثانی ویاے معروف وزاے معجمہ پیمانہ ایست مقدار دوازدہ صاع وہر صاع ہشت رطل باشد۔ از منتخب۔''(۱)

یعنی قفیز ایک پیمانہ ہے بارہ صاع کا اور صاع آٹھ رطل کا۔ منتخب میں ایسا ہی ہے۔

اور البشیر شرح نحو میر میں حضرت صدر العلما مولانا غلام جیلانی میرٹھی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں کہ: ''قفیز ایک پیمانہ ہے جس میں ۸۰ (اسی) کے سیر سے ۴۳ر سیر ۳ر چھٹانک ایک روپیہ بھر غلہ آتا ہے۔''(۲)

اور طحان کا معنی ہے: ''پیسنے والا''- ایک خاص مقدار میں آٹا پیسنے پر اسی آٹے میں سے ایک قفیز پیسنے والے کو دیتے تھے، اس لیے ''قفیز طحان'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔
اس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ پہلے کے زمانے میں آٹا چکی چلانے کے لیے کسی کا بیل کرایے پر لے لیتے اور اس کے بدلے میں اسی کے پسے ہوئے آٹے سے ایک قفیز آٹا اجرت قرار پاتا یا کسی انسان سے یہ معاملہ طے پاتا کہ وہ اس کا آٹا پیس دے اور اسی پسے ہوئے آٹے سے آدھا یا تہائی یا چوتھائی آٹا مزدوری لے لے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس سے منع فرمادیا کیوں کہ کام کرانے والا وقت عقد وہ مزدوری دینے پر قادر نہ تھا۔

فقہاے کرام نے اس سے یہ ضابطہ استنباط فرمایا کہ اس کے سوا بھی کوئی کام کرایا جائے اور اسی میں سے اجرت دینا طے ہو تو وہ قفیز طحان کے معنی میں ہے۔ لہذا اس کا حکم بھی یہی ہے کہ وہ ناجائز و فاسد ہے اور مسئلہ دائرہ میں بعینہ یہی شکل پائی جاتی ہے۔ کیوں کہ محصلین اور ارباب مدارس کے مابین معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی وصول کریں گے اس کا ۲۰/۳۰ر فی صد مثلاً اسے بطور حق المحنت ملے گا۔ اس سے ظاہر یہی ہے کہ وہ جو چندہ کریں گے اسی میں ۲۰ یا ۳۰ر فی صد انھیں اجرت دی جائے

(۱) غیاث اللغات۔ (۲) البشیر شرح نحو میر، ص:۱۵۹۔

گی۔ تو معلوم ہوا کہ اس میں ''قفیز طحان'' کا خبث موجود ہے جو اجارہ کو فاسد بنانے اور ناجائز ٹھہرانے کے لیے کافی ہے۔

بہار شریعت میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی:

''اجارہ پر کام کرایا گیا اور یہ قرار پایا کہ اسی میں سے اتنا تم اجرت میں لے لینا۔ یہ اجارہ فاسد ہے، مثلاً کپڑا بننے کے لیے سوت دیا اور کہہ دیا کہ آدھا کپڑا اُجرت میں لے لینا یا غلہ اٹھا کر لاؤ اس میں سے دو سیر مزدوری لے لینا یا چکی چلانے کے لیے بیل لیے اور جو آٹا پیسا جائے گا اس میں سے اتنا اجرت میں دیا جائے گا، یوں ہی بھاڑ سے چنے وغیرہ بھنواتے ہیں اور یہ ٹھہرا کہ ان میں سے اتنے بھنائی میں دیئے جائیں گے۔ یہ سب صورتیں ناجائز ہیں۔''(۱)

درمختار میں اس کا تعارف ان الفاظ میں ہے:

"ولو دفع غزلا لاخر لينسجه له بنصفه اى بنصف الغزل أو استأجر بغلاً ليحمل طعامه ببعضه أو ثوراً ليطحن بره ببعض دقيقه فسدت فى الكل لأنه استأجره بجزء من عمله والأصل فى ذلك نهيه صلى الله تعالى عليه وسلم عن قفيز الطّحان." (۲)

اگر کسی کو کپڑا بننے کے لیے سوت دیا اور طے پایا کہ اسی میں سے آدھا کپڑا مزدوری ہوگی یا غلہ لادنے کے لیے خچر کرایہ پر لیا اور طے پایا کہ اسی میں سے اتنا غلہ کرایہ ہوگا یا گیہوں پینے کے لیے بیل لیا اور طے ہوا کہ اسی میں سے اتنا آٹا کرایہ ہوگا۔ ان سب صورتوں میں اجارہ فاسد ہے۔ اس لیے کہ ان میں اجیر ہی کے عمل سے حاصل ہونے والی چیز میں سے کچھ اجرت میں دینا طے پایا۔ اور اس باب میں اصل حضور ﷺ کا ''قفیز طحان'' سے منع فرمانا ہے۔ (م ساجد)

(۱) بهار شريعت، ص:۱۳۹، حصه ۱٤.

(۲) الدرّ المختار على هامش ردّ المحتار، ص:۳۹–٤۰، ج:۵، باب الاجارة الفاسدة، ماجديه.

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"وصورة قفيز الطَّحّان: أن يستأجر الرجل من آخر ثوراً ليطحن به الحنطة على أن يكون لصاحبها قفيز من دقيقها أويستأجر انسانًا ليطحن له الحنطة بنصف دقيقها أو ثُلثِهِ أو ماأشبه ذلك فذلك فاسد." (۱)

''قفیز طحان'' کی صورت یہ ہے کہ آدمی گیہوں پینے کے لیے دوسرے سے بیل لے اور یہ طے ہو کہ اسی میں سے ایک قفیز آٹا بیل والے کا ہوگا۔ یا کسی کو گیہوں کے لیے اجیر رکھے اور یہ طے ہو کہ اسی میں سے آدھا یا تہائی وغیرہ اجرت ہوگی تو یہ اجارہ فاسد ہے۔(م.ساجد)

ظاہر ہے کہ مسئلہ دائرہ قفیز طحان کے مسئلے کے عین مطابق ہے، کیوں کہ وصولی کا ہی ایک مخصوص حصہ اجرت میں طے ہوتا ہے اور بہت ایسا ہوتا ہے کہ اسی میں سے ادائگی بھی ہوتی ہے۔اس لیے یہ اجارہ ناجائز ہونا چاہیے۔

مگر اب سوال یہ ہے کہ پھر سفرا سے کس طرح کام لیا جائے اور مدارس دینیہ کیسے چلیں؟ یہ ایسا سوال نہیں جسے نظر انداز کر دیا جائے۔ بلکہ اس کا حل ضروری ہے۔

قفیز طحّان کے فساد سے بچنے کی صورتیں

کتب فقہ میں اس فاسد معاملہ سے بچنے یا اس کو صحیح کرنے کی جو صورتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے تین یہاں بروے کار لائی جاسکتی ہیں:

(۱)**پہلی صورت** یہ ہے کہ بقدر ضرورت شرح کمیشن (وصولی کا فی صد) تو مقرر کر دیا جائے، لیکن خاص وصولی کے روپے میں سے اجرت دینا طے نہ کیا جائے، پھر اگر اسی روپے سے بعد حیلۂ شرعیہ کمیشن کی ادائگی ہو تو بھی شرعاً کوئی حرج

(۱) الفتاوى الهنديه، ص:٤٤٤، ج:٤، الفصل الثالث فى قفيز الطّحّان وماهو فى معناه من الباب الخامس عشر.

نہ ہوگا۔اور اگر روپے زکاۃ وغیرہ صدقات واجبہ کے نہ ہوں، بلکہ عطیات کے ہوں تو انھیں صرف دفتر میں جمع کر دینا کافی ہے، کسی حیلہ کی حاجت نہیں۔درمختار میں ہے:

"والحيلة أن ...... يسمى قفيزًا بلا تعيين ثم يعطيه قفيزًا منه فيجوز." (۱)

جواز کا حیلہ یہ ہے کہ اجرت کی مقدار ذکر کر دے، لیکن اجرت والی چیز متعین نہ کرے، پھر اگر اسی عمل میں سے اجرت مقررہ دے دے تو یہ جائز ہے۔

فتاویٰ عالم گیری میں ہے:

"والحيلة فى ذلك لمن أراد الجواز أن يشترط صاحب الحنطة قفيزًا من الدقيق الجيّد ولم يقل "من هذهِ الحنطة" أو يشترط رُبُعَ هذهِ الحنطة من الدقيق الجيد لأن الدقيق اذالم يكن مضافًا الىٰ حنطة بعينها يجب فى الذمة والأجر كما يجوز أن يكون مشاراً إليه يجوز أن يكون دينًا فى الذمة، ثم اذا جاز يجوز أن يعطيه رُبُعَ دقيق هذهِ الحنطة ان شاء. كذا فى المحيط." (۲)

اس سلسلے میں جواز کی راہ تلاش کرنے والے کے لیے حیلہ یہ ہے کہ گیہوں والا اجیر سے شرط کر لے کہ ایک قفیز عمدہ آٹا مزدوری دوں گا اور یہ نہ کہے کہ اسی گیہوں کے آٹے سے دوں گا یا یہ شرط کر لے کہ اس گیہوں کا چوتھائی عمدہ آٹا مزدوری دوں گا۔

ان دونوں صورتوں میں جواز کی وجہ یہ ہے کہ جب خاص اسی گیہوں کا آٹا دینا طے نہیں ہوگا تو صرف اتنا آٹا دینا ذمہ میں واجب ہوگا۔ اس لیے کہ اجرت میں جس طرح یہ جائز ہے کہ اس کی طرف اشارہ کر کے متعین کر دیا جائے، اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ وہ ذمہ میں دَین ہو۔ پھر جب اجارہ جائز ہو گیا تو اب اگر اسی گیہوں کے آٹے کا چوتھائی حصہ اجرت میں دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔ ایسا ہی "محیط" میں ہے۔(م.ساجد)

(۱) الدرّ المختار على هامش ردّ المحتار،ص:٤٠، ج:٥، باب الاجارة الفاسدة. ماجديه.

(۲) الفتاوى الهنديه، ص:٤٤٤، ج:٤، الفصل الثالث فى قفيز الطحّان وماهو فى معناه من الباب الخامس عشر.

بہار شریعت میں ہے:

''صورت جواز کی یہ ہے کہ مثلاً کہہ دے کہ دو سیر غلہ مزدوری دیں گے، یہ نہ کہے کہ اس میں سے دیں گے۔ پھر اگر اسی میں سے دے دے جب بھی حرج نہیں۔''(۱)

ان جزئیات سے یہ امر عیاں ہو کر سامنے آگیا کہ:

چندے کے روپے دفتر میں جمع ہوں تو اس سے کمیشن دینا جائز؟

اگر چندے کے روپے عطیات کے ہوں، زکاۃ وغیرہ صدقات واجبہ کے نہ ہوں تو دفتر میں جمع کرنے کے بعد جب بھی مدرسہ کی طرف سے اجرت دی جائے گی جائز ہوگی کہ یہ ادائیگی بہ ظاہر گو کہ اسی روپے سے محسوس ہو رہی ہے مگر:

اولاً: جب اس روپے سے دینا طے نہ ہوا تھا اور عقد اجارہ جائز تھا تو اب کسی بھی روپے سے اجرت دینا جائز ہوگا، جیسا کہ درج بالا جزئیات سے عیاں ہے۔

ثانیاً: یہ عین چندے کے روپے سے دینا نہیں ہے کیوں کہ روپے پیسے عقود و فسوخ میں متعین نہیں ہوتے، جیسا کہ درج ذیل جزئیہ سے واضح ہے:

"فان تزوّجها على الف فقبضتها ووهبتها له ثم طلقها قبل الدخول بها رجع عليها بخمس مأة، لأنه لم يصل اليه عين مايستوجبه، لأن الدارهم والدنانير لاتتعينان فى العقود والفسوخ." (۲)

مرد نے عورت سے ہزار روپے مہر پر نکاح کیا، عورت نے اس پر قبضہ کر کے شوہر کو ہبہ کر دیا، پھر شوہر نے اس کے ساتھ خلوت و یکجائی سے پہلے ہی طلاق دے دی تو وہ عورت سے پانچ سو روپے واپس لے گا، کیوں کہ اسے ہبہ کے ذریعہ اصل وہ روپے نہیں ملے ہیں جن کا یہ مستحق ہے، اس لیے کہ درہم و دینار (روپے و اشرفی) عقود و فسوخ میں متعین نہیں ہوتے۔

(۱) بهار شريعت، ص:۱۳۹، حصه: ۱٤.

(۲) هدايه، ج:۲، ص:۳۲۸، باب المهر، مجلس بركات.

صدقات واجبہ کے روپے سے بعد حیلہ کمیشن دینا جائز:

رہ گئے صدقات واجبہ مثل زکاۃ، صدقۂ فطر وغیرہا تو حیلۂ شرعیہ کے بعد اس طرح کے روپے سے بھی کمیشن دینا جائز ہونا چاہیے۔ کیوں کہ حیلۂ شرعی کے ذریعہ اصل مالک کی ملک ختم ہو جاتی ہے اور روپے فقیر کی ملک میں چلے جاتے ہیں۔ پھر وہ مدرسے کو چندہ دیتا ہے تو انجام کار یہ بھی چندہ ہو جاتا ہے۔

بہ لفظ دیگر شرعی نقطۂ نظر سے ملک کے بدلنے سے شے کا عین بھی حکماً بدل جایا کرتا ہے، جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ سے اس کا ثبوت ملتا ہے:

صحیحین وغیرہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ آپ کی آزاد کردہ لونڈی یا مکاتبہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا صدقہ کا گوشت پکا رہی تھیں، سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس میں سے کچھ تناول فرمانا چاہا تو عرض کی گئی کہ وہ حضرت بریرہ کو صدقے کے طور پر دیا گیا ہے۔ فرمایا:

"هولها صدقة ولنا هدية." (۱)

یہ گوشت بریرہ کے لیے صدقہ ہے اور ہمارے لیے اس کی طرف سے ہدیہ و تحفہ۔

اس حدیث کے ذیل میں حضرت علامہ احمد جیون رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رقم طراز ہیں:

"ان تبدّل الملك يوجب تبدّل العين حكمًا، فاذا كان العبد مملوكًا للمالك كان شخصًا آخر ثم اشتراه الزوجُ كان شخصًا آخر. واذا سلّمه اليها

حکم شرع کے اعتبار سے ملک بدلنا خود اس شے کے بدلنے کو مستلزم ہے۔ لہٰذا جب وہ غلام آقا کا مملوک تھا، ایک شخص تھا، پھر جب اسے شوہر نے خرید لیا تو وہ دوسرے شخص کے حکم میں ہو گیا اور جب

(۱) صحيح بخارى شريف، ص:۲۰۲، كتاب الزكوٰة، بابٌ اذا تحوّلت الصدقة. صحيح مسلم شريف، ص:۳٤٥، ج:۱، كتاب الزكوٰة، باب اباحة الهدية للنبى صلى الله تعالىٰ عليه وسلم وبنى هاشم. طحاوى شريف، ص:۳۲٤، ج:۱، باب الصدقة علىٰ بنى هاشم من كتاب الزكوٰة.

كان شخصًا آخر. والحجّةُ فى هذا الباب أنّ رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم دخل على بريرة يوما فقدّمت اليه تمرًا وكان القِدرُ يغلى فقال عليه السلام: ألاتجعلين لنا نصيبًا من اللحم؟ فقالت: يارسول الله! انه لحم تُصدّق عليّ، فقال عليه السلام: لكِ صدقة ولنا هدية. يعنى اذا أخذتِه من المالك كان صدقة عليكِ واذا أعطيته ايانا تصير هدية لنا. فعلم أن تبدّل الملك يوجب تبدّلا فى العين. وعلى هذا يخرج كثير من المسائل . اه."(۱)

وہ غلام بیوی کو مہر میں دیا تو وہ تیسرے شخص کے حکم میں ہو گیا۔ اور اس باب میں دلیل یہ ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک روز حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر تشریف لے گئے تو انھوں نے آپ کی ضیافت کے لیے کھجوریں پیش کیں اور ادھر ہانڈی میں گوشت پک رہا تھا تو سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: بریرہ! کیا تم ہمیں گوشت نہیں دوگی؟ انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ صدقہ کا گوشت ہے۔ سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: وہ تمہارے لیے صدقہ ہے اور ہمارے لیے تمہاری طرف سے ہدیہ۔ یعنی جب تو نے اسے مالک سے لیا تو وہ تیرے لیے صدقہ تھا اور جب تو ہمیں دے گی تو وہ ہمارے لیے ہدیہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ملک بدلنا خود اسی شے کے بدلنے کو مستلزم ہے اور اس سے بہت سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ (م۔ساجد)

اس کی نظیر مکاتب کا یہ مسئلہ ہے کہ اس نے اپنی آزادی کے لیے زکاۃ وصول کر کے اپنے آقا کو دیا مگر پورا معاوضہ ادا نہ کر سکا تو وہ مالِ زکاۃ اس کے آقا کے لیے حلال ۔ وجہ وہی مالِ زکاۃ کا ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہونا ہے۔ چنانچہ ہدایہ کتاب المکاتب میں ہے:

"قال (محمد فى الجامع الصغير): وما أدّى المكاتب

امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جامع صغیر میں فرمایا: مکاتب نے اپنی آزادی کے لیے مال

(۱) نور الانوار، ص:۴۱، مباحث الأمر.

من الصّدقات الىٰ مولاه ثم عجز فهو طيّب للمولىٰ لتبدّل الملك فان العبد يتملكه صدقة والمولىٰ عوضًا عن العتق. واليه وقعت الاشارة النبوية فى حديث بريرة "هى لها صدقة ولنا هدية" ...... ونظيره المشترى شراءً فاسدًا اذا أباح لغيره لايطيب له ولو ملّكه يطيب. اه." (۱)

زکاۃ وصول کر کے کچھ روپے آقا کو دیے، لیکن طے شدہ رقم ادا کرنے سے عاجز رہ گیا تو جو کچھ دے چکا ہے وہ آقا کے لیے حلال ہے، اس لیے کہ ملکیت بدل گئی، کیوں کہ مکاتب (غلام) وہ روپے زکاۃ کی حیثیت سے لیتا ہے اور آقا اس حیثیت سے لیتا ہے کہ وہ غلام کو آزاد کرنے کا بدلہ ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حدیث بریرہ میں اسی جانب اشارہ فرمایا ہے کہ "وہ بریرہ کے لیے صدقہ ہے اور ہمارے لیے اس کی طرف سے ہدیہ۔" اس کی نظیر یہ ہے کہ عقد فاسد کے ذریعہ کوئی سامان خریدنے والا اگر دوسرے کو اس سامان کے استعمال کی اجازت دے دے تو اس کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا، لیکن اگر مالک بنا دے تو اب اس کے لیے استعمال کرنا جائز ہو جائے گا۔ (م۔ساجد)

عنایہ میں "تبدّل الملك" کے تحت ہے:

"وتبدّل الملك كتبدّل العين. اه." (۲)

ملک کا بدلنا خود اس شے کے بدلنے کی طرح ہے۔ (م۔ساجد)

الدراية فى تخريج احاديث الهدايه میں ہے:

(۱) هدايه، ص:۳۲۳، ج:۳، باب موت المكاتب وعجزه، مجلس بركات.

(۲) الدراية علىٰ هامش الهداية، ص:۳۲۳، ج:۳، مجلس البركات.

حدیث: "هو لها صدقة ولنا هدية" فی قصة بريرة. متفق عليه من حديث عائشة رضى الله تعالىٰ عنها.(۱)

''وہ بریرہ کے لیے صدقہ ہے اور ہمارے لیے اس کی طرف سے ہدیہ''۔ یہ حدیث حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے واقعہ میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت سے بخاری و مسلم نے تخریج کی ہے۔(م.ساجد)

بنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

"لتبدل الملك" اى: لتغير الملك بتغير السبب...... وليس المراد منه التبدل حقيقة بأن يراد تبدّل الذات وانما المراد التبدّل الحكمى فافهم."(۲)

ہدایہ کی عبارت "لتبدل الملك" سے مراد سبب بدلنے سے ملک کا بدلنا ہے۔ اس سے تغیر حقیقی یعنی ذات کا بدلنا مراد نہیں ہے، بلکہ تغیر حکمی ہی مراد ہے۔ لہٰذا اسے سمجھیے۔(م.ساجد)

صدقات واجبہ میں جب تک حیلۂ شرعیہ نہ ہو جائے، ان میں کوئی تصرف کرنا شرعاً جائز نہیں، اس لیے عین صدقات کی رقوم سے اجرت کے دینے یا لینے کی کوئی صورت نہیں۔ سوا اس کے کہ کوئی ناخداترس بغیر حیلۂ شرعیہ کرائے دے دے یا محصل از خود لے لے، اسے تو کوئی جائز نہیں کہتا۔

جہاں تک اس بے بضاعت کی معلومات کا تعلق ہے ''اب عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ وصولی کے لحاظ سے اجرت کا تعین ہوتا ہے، لیکن یہ نہیں طے ہوتا کہ خاص وصولی ہی کے روپے میں سے کمیشن دیا جائے گا اور نہ ہی کسی سفیر یا کسی مہتمم کی یہ منشا ہوتی ہے کہ خاص اسی روپے میں اجرت لی یا دی جائے گی۔ مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ جتنی بھی وصولی

(۱) الدّراية على هامش الهداية، ص:۳۲۳، ج:۳، مجلسِ بركات.

(۲) البنايه شرح الهدايه، ص:۷۴۳، ج:۳، كتاب المكاتب وَ هكذا فى الدر المختار وحاشيته رد المحتار فى نفس الباب.

ہوگی، اس کا ۲۰ / یا ۳۰ / فی صد مثلاً کمیشن ہوگا، لیکن خاص اسی روپے میں سے ادائیگی بھی ہوگی، یہ کسی کا مقصد نہیں ہوتا۔ اس لیے اب اس اجارہ کے جواز بقدر ضرورت میں کوئی شبہہ نہیں رہ جاتا'' تاہم احتیاط یہ ہے کہ لفظوں میں بھی صراحت کر دی جائے کہ اجرت کا حساب تو کام کے لحاظ سے ہوگا، مگر مہتمم کسی بھی رقم سے کمیشن دے سکتا ہے۔

(۲) دوسری صورت: جو پہلی سے آسان تر ہے، یہ ہے کہ محصّل کا تقرر مدرسہ کی انتظامیہ نہ کرے، بلکہ قاضی شریعت ایک عامل کی حیثیت سے اس کا تقرر کرے، جسے قرآن حکیم نے زکاۃ کے مصارف سے شمار کیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

"اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا."(۱)

زکاۃ فقرا و مساکین اور عاملین کے لیے ہے۔

(آیت میں اس کے بعد دوسرے مصارف بھی شمار کیے گئے ہیں۔)

مجدد اسلام امام احمد رضا قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں:

''عامل زکاۃ جسے حاکم اسلام نے ارباب اموال سے تحصیل زکاۃ پر مقرر کیا وہ جب تحصیل کرے تو بحالت غنا بھی بقدر اپنے عمل کے لے سکتا ہے، اگر ہاشمی نہ ہو۔''(۲)

فتاویٰ عالم گیری میں ہے:

"ومنها العامل: وهو من نصبه الامام لاستيفاء الصّدقات والعشور. كذا فى الكافى. و يعطيه مايكفيه وأعوانهٗ بالوسط مدة ذهابهم وَ إيابهم مادام

زکاۃ کا ایک مصرف عامل ہے اور یہ وہ شخص ہے جسے حاکم اسلام نے صدقات اور عشر کی وصولی کے لیے مقرر کیا ہو۔ (ایسا ہی کافی میں ہے) عامل کو حق المحنت اتنا دیا جائے جو اس کی وصولی پر جانے اور آنے کی مدت تک متوسط طور پر اس

(۱) آية: ٦٠۔ سورة التوبة ٩.

(۲) فتاوىٰ رضويه، ص:٤٦٥، ج:٤، سنى دار الاشاعت، مبارك پور۔

"المال باقیا، الآ اذا استغرقت کفایته الزکاۃ فلا یزاد علی النصف. کذا فی البحر الرائق."(۱)

کو اور اس کے مددگاروں کو کافی ہو، لیکن اگر اس کے اخراجات اس کی وصولی کا سارا مال دینے پر پورے ہوں تو آدھے سے زیادہ نہ دیا جائے۔ ایسا ہی بحر الرائق میں ہے۔

تنویر الابصار و در مختار میں ہے:

"(وعامل فیُعطی) ولو غنیا، لاھاشمیا (بقدر عمله) مایکفیه واعوانه بالوسط، لکن لایزاد علی نصف مایقبضه. اه ملخصًا."(۲)

عامل کو اس کے کام کے لحاظ سے اتنا دیا جائے جو اوسط خرچ سے اس کے اور اس کے مددگاروں کے لیے کافی ہو، اگرچہ وہ غنی ہو، لیکن ہاشمی نہ ہو۔ ہاں! جتنی رقم وصول کر کے لایا ہے، اس کے نصف سے زیادہ نہ دیا جائے۔

اس صورت میں محصلین "اجیر" کے بجائے "عامل" کے نام سے موسوم ہوں گے اور خاص مال زکاۃ سے بھی انھیں گزارے کے لائق حق المحنت دینا، لینا جائز ہوگا، گو کہ وہ غنی ہوں۔

مسلمانوں کے زوال و پستی کے اس عہد میں کہ حاکم اسلام نہیں پایا جاتا اور پورے ملک کا کسی ایک عالم پر اتفاق دشوار ہے۔ مسلمانوں کا "امیر شریعت" اعلم علمائے بلد ہے۔ جو اپنے شہر کے سنی عالموں میں سب سے زیادہ فقیہ مرجع فتویٰ ہو۔ فتاویٰ رضویہ میں حدیقہ ندیہ سے ہے:

"اذا خلا الزمان من سلطان ذی کفایة فالأمور موکلة الی

جب زمانہ دینی ضرورتوں کے پورا کرنے والے بادشاہِ اسلام سے خالی ہو تو شریعت کے امور علما کے سپرد ہوں گے اور امت پر ان کی طرف

(۱) الفتاوی الهندیة، ص:۱۸۸، ج:۱، الباب السابع فی المصارف.

(۲) تنویر الابصار، والدّر المختار فوق رد المحتار، ص:۵۹ — ۶۰، ج:۴، باب المصارف.

العلماء ویلزم الأمة الرجوعُ الیهم ویصیرون وُلاۃً. فاذا عسر جمعُهم علی واحدٍ استقل کل قطر باتباع علمائه فان کثروا فالمتبع أعلمهم فان استووا اقرع بینهم."

رجوع لازم ہوگا اور یہ حضرات "والی شرع" ہوں گے پھر جب کسی ایک عالم پر سارے لوگوں کا اتفاق دشوار ہو تو ہر صوبہ و گوشہ کے لوگ اپنے یہاں کے علما کی اطاعت کریں اور اگر علما زیادہ ہوں تو ان میں کا سب سے بڑا عالم لائق اطاعت ہوگا اور اگر سب علما علم میں ایک درجہ کے ہوں تو قرعہ اندازی کی جائے۔

اللہ عز وجل فرماتا ہے:

"اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ."(۱)

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے "اولی الامر" کی۔

ائمہ دین فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ آیہ کریمہ میں "اولی الامر" سے مراد علمائے دین ہیں: "نصّ علیه العلامة الزرقانی فی شرح المواهب وغیرُه فی غیره."(۲)

(۳) **تیسری صورت ھے**: عمل لوجہ اللہ یعنی بلا نیت اجر محض رضائے الٰہی کے لیے کوئی شخص یہ دینی کام کرے۔ یہ بلا شبہہ جائز و مستحسن ہے اور اس طور پر چندہ کرنے والا مستحق اجر و ثواب، جیسا کہ خدائے پاک کا ارشاد ہے:

"وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ."(۳)

اور جو کوئی اپنی طرف سے بھلا کام کرے تو اللہ نیکی کا صلہ دینے والا خبردار ہے۔

بہار شریعت میں اس صورت کے تعلق سے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ:

"یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب اصل مذہب یہی ہے کہ (اطاعت و عبادت کے کاموں پر) یہ اجارہ ناجائز ہے، ایک دینی ضرورت کی بنا پر

(۱) آیة:۵۹، سورة النساء ۴، والمحصنٰت ۵.

(۲) فتاوی رضویه، ص:۲۰۶، ج:۳، سنی دار الاشاعت، مبارک پور.

(۳) آیة:۱۵۸، سورة البقرة ۲، سیقول ۲.

اس کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے تو جس بندۂ خدا سے ہو سکے کہ ان امور کو محض خالصاً لوجہ اللہ انجام دے اور اجر اخروی کا مستحق بنے، تو اس سے بہتر کیا بات ہے۔ پھر اگر لوگ اس کی خدمت کریں، بلکہ یہ تصور کرتے ہوئے کہ دین کی خدمت یہ کرتے ہیں، ہم ان کی خدمت کر کے ثواب حاصل کریں تو دینے والا مستحق ثواب ہوگا اور اس کو لینا جائز ہوگا کہ یہ اجرت نہیں بلکہ اعانت و امداد ہے۔"(۱)

اللہ کا شکر ہے کہ آج کے دور میں بھی بہت سے اللہ کے نیک اور مخلص بندے ہیں جو خالص رضائے الٰہی کے لیے یہ کام کرتے ہیں اور کچھ بھی نہیں لیتے، بلکہ کتنے ایسے ہیں جو اس راہ کے مصارف بھی اپنی جیب خاص سے پورے کر لیتے ہیں اور "اِنْ اَجْرِیَ اِلاَّ عَلَی اللّٰہِ" ان کا شعار ہوتا ہے۔

بہار شریعت کی درج بالا وضاحت سے معلوم ہوا کہ مدرسہ کے مہتمم یا دوسرے لوگ اپنے مال سے ایسے شخص کی اعانت کریں تو جائز اور باعث اجر و ثواب ہے، لیکن مدرسہ کے مال سے اس کی اعانت جائز نہیں، کیوں کہ وہ مال تو خاص مدرسہ کے مصالح میں صرف کرنے کے لیے ہے تو اسے اعانت مسلم میں صرف کرنا جائز نہ ہوگا کہ یہ شے کے مقصود میں تغییر و تبدیل ہوگی جس کی شرعاً اجازت نہیں۔ حتی کہ علما فرماتے ہیں کہ کسی غرض کے لیے کسی نے چندہ دیا اور کام کے بعد اس میں سے کچھ بچ رہا تو بھی اسے دوسری غرض میں از خود صرف کرنا حرام اور اسی جیسی دوسری غرض میں صرف کرنا واجب ہے جب کہ چندہ دینے والے کا پتہ نہ چلے اور اگر اس جیسا کوئی دوسرا کام نہ ملے تو فقرا پر تصدق کا حکم ہے، اعانت مسلم میں صرف کرنے کی اب بھی اجازت نہیں، جیسا کہ امام احمد رضا قدس سرہ کے ارشادات ذیل سے واضح ہے:

"چندہ کا جو روپیہ کام ختم ہو کر بچے لازم ہے کہ چندہ دینے والوں کو حصۂ رسد واپس دیا جائے یا وہ جس کام کے لیے اب اجازت دیں، اس میں صرف ہو، بے ان

(۲) بہار شریعت، ص:۱۲۶، ج:۱۴۔

کی اجازت کے صرف کرنا حرام ہے۔ ہاں! جب ان کا پتہ نہ چل سکے تو اب یہ چاہیے کہ جس طرح کے کام کے لیے چندہ لیا تھا، اسی طرح کے دوسرے کام میں اٹھائیں، مثلاً تعمیر مسجد کا چندہ تھا، مسجد تعمیر ہو چکی تو باقی بھی کسی مسجد کی تعمیر میں اٹھائیں۔ غیر کام مثلاً تعمیر مدرسہ میں صرف نہ کریں اور اگر اس طرح کا دوسرا کام نہ پائیں تو وہ باقی روپیہ فقیروں کو تقسیم کر دیں۔ دُرِّ مختار میں ہے: "ان فضل شيء رد للمتصدق ان علم والاّ كفن به مثله والاّ تصدق به." اسی طرح فتاویٰ قاضی خان و عالم گیریہ وغیرہما میں ہے۔"(۱)

ایک دوسرے مقام پر خانیہ و ہندیہ کی عبارتیں نقل فرما کر لکھتے ہیں:

"فهذا نص في الترتيب ولا شك أن باختياره يخرج عن العهدة بيقين ثم هذا وان لم يكن وقفًا فله شبه به ولا شك أن مراعاة غرض المالك أملك وأحكم فلذا عوّلنا عليه."(۲)

فتاویٰ خانیہ و فتاویٰ ہندیہ کی یہ عبارتیں مذکورہ ترتیب کے وجوب کے سلسلے میں صریح ہیں۔ آدمی اس ترتیب کو اختیار کرنے سے یقیناً اپنی ذمہ داری سے بری ہو جائے گا۔ اور مندرجہ بالا مسئلہ اگرچہ وقف کا نہیں ہے، لیکن اسے وقف سے مشابہت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مالک (وقف کرنے یا چندہ دینے والے) کی غرض کا لحاظ رکھنا زیادہ مناسب اور بہتر ہے، اسی لیے ہم نے اس پر اعتماد کیا ہے۔ (م ساجد)

ظاہر ہے کہ مدرسہ کے لیے جو کچھ وصولی ہوتی ہے وہ مدرسہ کی ضروریات سے عموماً فاضل نہیں بچتی اور اگر بچے بھی تو وہ اسی کے مصالح میں صرف ہوتی رہتی ہے اور مدرسہ کو ہمیشہ مزید رقم کی احتیاج ہوتی ہے، اس لیے اسے غرض مثل میں صرف کرنے یا

(۱) فتاویٰ رضویہ، ص:۳۶۸، ج:۶، سنی دار الاشاعت، مبارک پور۔

(۲) فتاویٰ رضویہ، ص:۳۴۰، ج:۶، سنی دار الاشاعت، مبارک پور۔

فقرا پر صدقہ کرنے اور معاونین سے اجازت لینے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور بطور انعام یا اعانت اس میں سے کسی کو دینے کی تو کبھی اجازت نہیں۔ حتی کہ جس مسلم فقیر کے ذریعہ حیلۂ شرعیہ کرایا جاتا ہے وہ اگر رقم دیتے وقت یہ صراحت کردے کہ مدرسہ کے اغراض ومقاصد میں صرف کرنے کے ساتھ خالِصًا لِوجہ اللہ وصول کرنے والوں کو بھی اس میں سے بطور اعانت یا انعام دیا جاسکتا ہے تو بھی اسے نہ دینا چاہیے کیوں کہ اہل خیر نے زکاۃ اس لیے دی ہے کہ انتظامیہ اس کا حیلۂ شرعیہ مدرسہ کے لیے کرائے اور اس میں صرف کرے، نہ یہ کہ کسی رضا کار کی اعانت یا انعام کے لیے حیلہ کرائے۔

اس مقام پر دو ضروری باتیں خاص طور سے لائق توجہ ہیں جن کا خیال مدارس کی انتظامیہ اور سفرا کو لازمی طور پر رکھنا چاہیے:

(ا) **شرح کمیشن کی مقدار:** ظاہر ہے کہ زکاۃ، فطرہ و دیگر صدقات واجبہ کے مصرف فقرائے مسلمین وغیرہ ہیں، مگر دینی علوم کے تحفظ وبقا اور فروغ وترقی کی اہم ترین ضرورت کے پیش نظر مدارس اسلامیہ میں ان رقوم کو خرچ کرنے کے لیے حیلۂ شرعی کی اجازت دی گئی ہے۔ اس لیے یہ رعایت ضرور ہونی چاہیے کہ: ''ایسی رقوم کا کثیر ووافر حصہ ان مدات میں صرف ہو جن کا تعلق براہِ راست علوم دینیہ کے تحفظ وبقا سے ہے، مثلاً مدرسین کی تنخواہ، کتابوں کی فراہمی، تبلیغ واشاعت دین کے دوسرے شعبوں نیز طلبہ کے لیے روشنی اور خورد ونوش کا انتظام وغیرہ کہ یہی امور حیلۂ شرعی کے جواز کے اصل اسباب ومحرکات ہیں۔

سفارت بھی مدرسہ کا ایک شعبہ ہے، اس لیے اس کی اجرت بھی اس فنڈ سے دی جاسکتی ہے۔ مگر اس فیاضی وفراخ دلی کے ساتھ نہیں کہ کسی کی مہینہ بھر کی اجرت تیس چالیس ہزار تک پہنچ جائے کہ یہ شرعی حدود سے تجاوز اور ناجائز وگناہ ہے۔''

عجب نہیں کہ بعض بزرگوں نے اپنے فتویٰ عدم جواز میں اس مفسدہ کے سدِّ باب کا بھی لحاظ فرمایا ہو۔

حیلۂ شرعیہ کا جواز بوجہ ضرورت ہے، تو جتنی اجرت مقرر کرنے میں یہ ضرورت پوری ہوسکے، اس سے زیادہ کے تعین کی قطعاً اجازت نہیں دی جاسکتی۔ "الضرورۃ تتقدر بقدرھا" اس لیے ہر سفیر کی اجرت یا شرح کمیشن بس اتنی مقرر کی جائے جتنے میں اوسط خرچ کے لحاظ سے اس کے مصارف سفر اور وصولی کے دنوں کی ضروریات پوری ہوسکیں۔

غور فرمایئے کہ عامل جسے قرآن حکیم میں زکاۃ کا مصرف بتایا گیا ہے، اسے بھی بقدر کفایت ہی دینے کی اجازت ہے، حتی کہ اگر اس کے مصارف زیادہ ہوں یا وصولی کم ہو جس کے باعث وصولی کے بیشتر حصہ یا پوری وصولی سے اس کی ضروریات کی کفایت ہوتی ہو تو اب بقدر کفایت بھی دینے کی اجازت نہیں، زیادہ سے زیادہ نصف وصولی سے اس کی خدمت کی جاسکتی ہے۔

اس میں حکمت یہ ہے کہ زکاۃ وغیرہ صدقات واجبہ کے اصل مصارف فُقرا ومساکین وغیرہ ہیں اور انھیں پر صرف کرنے کے لیے عامل سے زکاۃ کی وصولی کا کام لیا جاتا ہے، مگر چوں کہ وہ اپنے آپ کو اسباب معیشت کی تحصیل سے خالی کر کے دین کا یہ کام کرتا ہے۔ اس لیے ضرورت پیش آئی کہ اس کو گزارہ کے لائق حق المحنت دے کر فارغ البال رکھا جائے، تاکہ اس کے اوپر کوئی حرج اور تنگی نہ آنے پائے اور وہ طلب معاش میں مشغول ہو کر کہیں یہ کام چھوڑ نہ دے، جس کے باعث وہ مصالح شریعت فوت ہوجائیں جو زکاۃ کی مشروعیت کے اصل اسباب ہیں، جیسا کہ مَلِکُ العلما علامہ ابوبکر ابن مسعود کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بلند پایہ تصنیف بدائع الصنائع میں اس حکمت کا انکشاف فرمایا اور محقق ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ نے البحر الرائق میں اس کی توثیق فرمائی۔ چناں چہ درمختار میں ہے:

"لانہ فرَّغ نفسہ لھذا العمل فیحتاج إلی الکفایۃ.	عامل کو مال زکاۃ سے حق المحنت دینا اس لیے جائز ہے کہ اس نے اس کام کے لیے اپنے آپ کو خالی

کر دیا ہے، تو وہ بہ قدر کفایت روزی کا محتاج ہے اور "مال داری" بہ وقت حاجت زکاۃ لینے سے مانع نہیں جیسے کہ مسافر کے لیے مانع نہیں۔	والغنى لايمنع من تناولها عند الحاجة كابن السبيل. بحر عن البدائع." (۱)

اب یہاں دو باتیں ہیں: دفع حرج اور جلب مصلحت، تو شریعت طاہرہ نے دونوں کا لحاظ کرتے ہوئے یہ فرمان جاری کیا کہ دفع حرج کے لیے بہ قدر ضرورت مال زکاۃ سے حق الحنت دیا جائے اور جلب مصلحت کے لیے بقیہ رقم کو اس کے اصل مقاصد میں صرف کیا جائے۔ لیکن جہاں ساری رقم یا اس کے بیشتر حصے سے ضرورت پوری ہو رہی ہو وہاں پر صرف ضرورت کا لحاظ کر کے بنیادی مقاصد کو فوت نہ کیا جائے، بلکہ ضرورت اور مقصد شریعت دونوں کی حتی الامکان رعایت یوں کی جائے کہ کم سے کم آدھی رقم "مقصد شریعت کی تکمیل میں ضرور خرچ ہو اور "ضرورت عامل" کے لیے زیادہ سے زیادہ نصف رقم میں تصرف ہو اور یہ رعایت دونوں کے رتبے کے تفاوت کے پیش نظر بہت مناسب ہے اور عقل وقیاس کے قرین وقریب بھی، کہ اس طرح سے نہ تو مقصد شریعت فوت ہوا اور نہ ہی ضرورت عامل سے بے اعتنائی کر کے حرج ومشقت میں پڑنے کا دروازہ کھولا گیا۔

اگر صرف کسی ایک کا لحاظ کیا جاتا تو دوسری طرف مصالح شریعت سے دوری اور راہِ حق سے انحراف لازم آتا، جو اسلام کے حکیمانہ اصول کے قطعی خلاف ہے۔

اس تفصیل سے اگر ایک طرف ائمہ حنفیہ کی دقت فکر ونظر معلوم ہوتی ہے اور فقہ حنفی کے کتاب وسنت اور عقل وقیاس کے عین موافق ہونے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے تو دوسری طرف مسئلہ دائرہ کے تاریک گوشوں پر بھی بہ خوبی روشنی پڑتی ہے کہ زکاۃ اور دیگر صدقات واجبہ کی رقوم میں دینی علوم کی بقا وترقی کے اہم ترین مقاصد کے لیے حیلۂ شرعی کی اجازت دی گئی ہے۔ اس لیے بعد حیلہ یہ رقم زیادہ سے زیادہ انھیں

(۱) الدر المختار، ص:۲۸۴-۲۸۵، ج:۳، باب المصرف.

مقاصد عالیہ کے حصول میں صرف ہونا ضروری ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ سفرا طلب معاش کے تمام ذرائع سے بے نیاز ہو کر چند دنوں تک صدقات کی وصولی کے لیے اپنے کو فارغ کر لیتے ہیں تو ضرورت ہے کہ عامل کی طرح سے انھیں بھی بہ قدر کفایت مزدوری دی جائے تاکہ انھیں کوئی حرج وتنگی نہ لاحق ہو اور تحصیل رزق کی فکر میں یہ کام چھوڑ نہ دیں جس کے نتیجے میں اصل مقاصد ہی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ لہٰذا دفع حرج اور جلب مصلحت کے لیے سفرا کو حیلۂ شرعی کر کے اجرت دینا جائز ہے لیکن قدر حاجت سے زیادہ ناجائز ہے۔ جیسا کہ خود عاملین کے لیے بھی ایسی زیادتی ناجائز ہے۔

(۲) امانت: سفرا کی حیثیت اجیر خاص کی ہو یا اجیر مشترک کی بہر حال وصول کردہ رقم ان کے پاس امانت ہوا کرتی ہے اور وہ اس کے امین ومحافظ ہوتے ہیں، جیسا کہ بہار شریعت[1] میں ہدایہ ودر مختار کے حوالے سے اس کی تصریح کی گئی ہے۔

ہدایہ کی عبارت یہ ہے:

اجیر مشترک وہ ہے جو کام پورا کر لینے کے بعد ہی اجرت کا حق دار ہوتا ہے اور سامان اس کے پاس امانت ہے۔ (لہٰذا اگر وہ ضائع ہو جائے تو اس پر تاوان نہیں) اور **اجیر خاص** کے پاس سے سامان ضائع ہو جائے تو اس پر بھی تاوان نہیں ہے، اس لیے کہ سامان اس کے پاس امانت ہے۔ (م.ساجد)	"فالمشترك من لا يستحق الأجرة حتى يعمل والمتاع أمانة فى يده............ ولا ضمان علىٰ الأجير الخاص لأنّ العين أمانة فى يده. اهـ. ملخصًا." (۲)

اور امین کا فرض یہ ہے کہ وہ مالِ امانت میں کوئی تصرف اور خیانت نہ کرے،

(۱) ملاحظه هو، ص:۱۴۵-۱۴۹، ج:۱۴، ضمان اجير كا بيان.
(۲) هدايه، ص:۲۹۲-۲۹۴، ج:۳، مجلس بركات، مبارك پور.

اس لیے محصلین کو وصول کیے ہوئے روپے میں سے اپنے طور پر کچھ خرچ کرنا جائز نہیں، ان پر واجب ہے کہ خاص اپنا مال یا جس مال میں شرعاً تصرف کی اجازت ہے اسے مصارف سفر وغیرہ میں استعمال کریں ورنہ خیانت کے مرتکب وگنہ گار ہوں گے۔

بعض سفرا سے خیانت کا ارتکاب: بعض سفرا کے متعلق سنا گیا کہ وہ اپنی اجرت پہلے ہی وضع کر کے خرچ کر لیتے ہیں، صدقات کی رقوم میں بھی اس سے احتراز نہیں کرتے اور بعض تو کل وصولی خرچ کرنے کے بعد رفتہ رفتہ ادا کرتے ہیں۔ یہ سخت بد دیانتی اور مالِ امانت میں خیانت ہے۔ ایسے لوگ یہ ناپاک جرم کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ انھیں ایک روز خدائے قہار کے حضور جواب دہ ہونا ہے۔

اللہ رب العزت جل جلالہ ارشاد فرماتا ہے:

"یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ." (۱)	اے ایمان والو! اللہ ورسول سے دغا نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں دانستہ خیانت کرو۔

نیز دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ لَایُحِبُّ الْخَائِنِیْنَ." (۲)	بیشک اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

حدیث صحیح میں حضور اقدس ﷺ نے منافق کی ایک علامت یہ بتائی کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے:

"عن أبی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: آیة المنافق ثلث: اذا حدث كذب واذا وعد أخلف واذا أوتمن خان." (۱)	حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ منافق کی تین علامتیں ہیں۔ (۱) جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ (۲) جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔ (۳) اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

(۱) آیة: ۲۷، سورة الانفال ۸، قال الملأ — ۹۔

(۲) آیة: ۵۸، سورة الانفال ۸، واعلموا — ۱۰۔

اس لیے مسلمانوں اور خاص کر دین کے خادموں کو اس قسم کے گناہوں کی آلودگیوں سے پاک اور منزہ رہنا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ حبیبه النبی الکریم علیه وعلیٰ آله وصحبه وازواجه الصلوٰة والتسلیم۔

کمیشن میں اضافہ کی گنجائش: ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ زکاۃ وصدقات کی وصولی کرنے والے سفرا اگر قاضی شرع کے تقرر کے بعد ''عامل'' کی حیثیت سے کام کریں تو انھیں خود مال زکاۃ سے بہ قدر کفایت مزدوری دینا جائز ہے۔ اور اگر اجیر خاص یا اجیر مشترک کے طور پر وصولی کریں تو ضرورت شرعیہ کی بنا پر زکاۃ وصدقات کی رقوم سے حیلۂ شرعی کے بعد ان کو دینا جائز ہے، خواہ وہ اجرت بنام تنخواہ دی جائے یا بنام کمیشن۔

لیکن یہاں اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ ''اجارۂ سفارت'' کے لیے حیلۂ شرعیہ کا جواز بوجہ ضرورت شرعیہ ہے۔ اس لیے ہمیں یہاں اس حیثیت سے بھی بڑی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ اوپر ذکر کیے ہوئے طریقے دور حاضر میں شرعی تقاضوں اور دینی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کافی ہیں یا نہیں؟

اس بے بضاعت کے خیال میں اجیر خاص والا طریقہ ناکافی ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ اس قسم کے سفرا نے عام طور سے کوئی ہمت افزا کام نہیں کیا، جو کچھ وصول کر کے لائے، وہ ان کی اجرت ہی کی نذر ہو گیا یا برائے نام کچھ فاضل بچ رہا، جس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے اندر طمع دنیا، خدا ناترسی عام ہو چکی ہے۔ دین اور اس کے معاملے میں

(۱) صحیح مسلم شریف، ج:۱، ص:۵۶، باب خصال المنافق۔

سہولت پسندی و تن آسانی ہمارا شیوہ ہو چکا ہے۔

"اجیر مشترک" کا معاملہ بہ ظاہر مفید معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کمیشن پانے کے لیے سفرا وصولی کے بڑھانے میں پوری لگن و جفاکشی کا مظاہرہ کریں گے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج کل عامۂ مدارس میں یہی طریقہ کار رائج ہے، مگر جیسا کہ اوپر بیان ہوا، شرح کمیشن بھی بہ قدر کفایت ہی مقرر کرنے کی اجازت ہے۔ پس اگر اسی کے اعتبار سے کمیشن کا تعین ہو جائے تو شاید سفرا اس کے لیے کم آمادہ ہوں۔ الا ماشاء اللہ۔ اور آخر کار یہ مذہبی ادارے سخت خسارے کا شکار ہو سکتے ہیں۔

اب ہمارے سامنے دو ہی صورت ہے یا تو اداروں کو مخمصہ کے حال میں چھوڑ دیں یا شرح کمیشن میں قدر کفایت پر اتنا اضافہ کیا جائے کہ اس کے حصول کے لیے دلوں میں خواہش پیدا ہو اور سفرا آمادہ ہو سکیں۔

ظاہر ہے کہ دور حاضر میں دین کی حفاظت و صیانت مدارس اسلامیہ پر ہی موقوف ہے اگر وہ خدا نہ کرے بند ہو جائیں تو پھر دین کا خدا حافظ۔ اس لیے ضرورت شرعیہ اس کی داعی ہے کہ کم سے کم وصولی کا فی صد اتنا مقرر کیا جائے جو سفرا کی رغبت اور وصولی میں اضافہ کا باعث بنے، تا کہ جس ضرورت کی بنا پر شرع مطہر نے یہ اجارہ جائز قرار دیا ہے وہ ضرورت پوری ہو سکے۔

"الضرورة تتقدر بقدرها." ضرورت کا لحاظ ضرورت بھر ہوا کرتا ہے۔

اس لیے مسئلہ دائرہ میں قدر کفایت پر ضرورت بھر کا اضافہ جائز ہونا چاہیے۔ عامل کے لیے بھی بہ قدر ضرورت اضافہ کی گنجائش ہونی چاہیے، اگر ایسا ممکن ہو تو محصل کی جگہ عامل سے کام لینے کو ترجیح دینا چاہیے کہ اس میں سہولت زیادہ ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

سوال نامہ

چودھواں فقہی سمینار مجلس شرعی جامعہ اشرفیہ مبارک پور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً

سفرا و محصلین سے کمیشن پر چندہ کرانا جائز ہے یا ناجائز؟

یہ مسئلہ ہمارے اجلۂ فقہاے کرام کے درمیان اختلافی رہا ہے۔ حضرت مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ناجائز قرار دیتے تھے۔ آپ کا ایک مصدقہ فتویٰ خود راقم الحروف نے دیکھا ہے اور حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور حضرت بحر العلوم مدظلہ العالی سے سنا بھی ہے۔ حضرت بحر العلوم کا مزید بیان ہے کہ:

> "خیال ایسا آتا ہے کہ حضرت مولانا غلام یزدانی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کمیشن کی حلت کا سبب ضرورت شرعیہ کو قرار دیا تھا لیکن حضرت مفتی اعظم علیہ الرحمہ کا فرمانا یہ تھا کہ ضرورت شرعیہ متحقق نہیں اور اس کے ثبوت میں خود اپنے مدرسہ کو پیش فرماتے تھے کہ یہاں بغیر کمیشن کے ہی وصولی چندہ متحقق ہے۔"

حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کئی دفعہ یہ بیان فرمایا کہ حضرت مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے کہ ضرورت متحقق نہیں ہے اور ثبوت میں اپنے مدرسہ مظہر الاسلام کو پیش فرماتے اور عدم جواز کی وجہ یہ بتاتے کہ کمیشن "قفیز طحان" کے حکم میں ہے۔

مگر آج حالات پہلے کی بہ نسبت بہت بدل چکے ہیں۔ اب اگر کمیشن پر چندہ کا دروازہ بند کر دیا جائے تو مدارس موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو سکتے ہیں یا پھر

اساتذہ، طلبہ، درجات، شعبہ جات اور دوسرے عملہ کی تعداد بہت محدود کرنی پڑے گی۔ خود حضرت مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے عہد میں بھی کچھ علما کو ضرورت کے تحقق کا احساس ہونے لگا تھا۔ اور اب تو عام طور پر مدارس اس میں مبتلا بھی ہو چکے ہیں۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ آج کے بدلے ہوئے حالات میں ایک بار پھر اس مسئلے پر غور کر لیا جائے۔ درج ذیل سوالات کی روشنی میں مسئلے کی تنقیح ہو سکتی ہے۔

(۱) کمیشن پر چندے کا یہ معاملہ کس عقد شرعی کے تحت آتا ہے اور سفرا کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(۲) کیا آج کے دور میں ضرورت شرعیہ متحقق ہو چکی ہے جس کی بنا پر چندے کے کمیشن میں "قفیز طحان" مباح ہو جائے؟

(۳) اور کیا بہر حال یہاں اس امر کی گنجائش ہے کہ اگر بہ وقت معاہدہ یہ صراحت کر دی جائے کہ اجرت وصول کی ہوئی رقم سے نہ دیں گے تو اجارہ جائز ہو جائے گو کہ بعد میں اجرت اسی عطیہ کی رقم سے یا بعد حیلہ شرعیہ زکاۃ وغیرہ صدقات واجبہ کی رقم سے یا دوسرے کی وصول کردہ رقم سے یا ان کے سوا کسی اور رقم سے دی جائے؟

(۴-الف) اگر قاضی شریعت یا اعلم علماے بلد دیانت دار محصلین کو بحیثیت عامل مقرر کر دے تو کیا وہ "عامل شرعی" ہوں گے جو مصارف زکاۃ سے ہیں؟

(ب) اگر جواب اثبات میں ہو تو سوال نمبر ۱-۲ کے مطابق کمیشن کو مباح مان کر اسی کو جاری رکھنا زیادہ مناسب ہوگا یا عامل کا تقرر کر کے اصل منصوص طریقے کو اختیار کرنا زیادہ مناسب ہوگا؟

(۵) اور بہر حال اجیر یا عامل اپنی وصول کردہ زکاۃ یا عطیہ سے کچھ رقم اپنے طور پر خرچ کر لے تو کیا زکاۃ ادا ہو جائے گی؟ اور بہر حال اجیر یا عامل کے لیے کیا حکم ہے؟

محمد نظام الدین رضوی
خادم اشرفیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ العزیز الرحمٰن☆ الذی خلق الانسان و علّمہٗ البیان☆ والصلاۃ والسلام علیٰ سید الانس و الجان☆ و علی السابقین الاولین من المھاجرین والانصار☆ و الّذین اتبعوھم باحسان☆ رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ☆

جوابات

جواب (۱):۔ کمیشن یعنی ۲۵/۳۰ر فی صد پر چندے کی وصولی کے تعلق سے سُفرا اور مدارس کے درمیان جو معاہدہ ہوتا ہے وہ شرعی نقطۂ نظر سے اجارہ ہے، وہ بھی اجارہ کی ایک خاص قسم "اِجارہ علی العمل"، یعنی کام پر معاوضہ کا معاہدہ۔

"اجارہ علی العمل" اس لیے ہے کہ اس معاہدہ میں اجرت کام کے لحاظ سے مقرر ہوتی ہے۔ مثلاً سو روپے کی وصولی پر بیس یا تیس روپے یعنی بیس فی صد یا تیس فیصد۔ جیسے اسی وجہ سے درزی اور دھوبی وغیرہ کے اجارہ کو فقہانے "اجارہ علی العمل" سے شمار کیا ہے۔

درزی اور دھوبی وغیرہ کی طرح سے کمیشن پر وصولی کرنے والا سفیر بھی کسی خاص وقت میں کسی خاص مدرسہ یا تنظیم کا ہی چندہ کرنے کا پابند نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک ساتھ دو یا اس سے زیادہ مدارس کا چندہ بھی کر سکتا ہے۔ اس لیے کمیشن پر چندہ کرنے والا سفیر فقہی اصطلاح کے مطابق "اجیر مشترک" ہوتا ہے جب کہ ماہانہ تنخواہ پر چندہ کرنے والا "اجیر خاص" کہلاتا ہے۔

البتہ سفرا کا یہ اجارہ دو طرح سے فاسد و ناجائز ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ یہ قفیز طحان کے حکم میں ہے جیسا کہ حضور مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے۔

اور دوسرے اس وجہ سے کہ اس اجارے میں کام کی مقدار اور اس کی

اجرت مجہول ہوتی ہے۔ پہلی ''وجہِ فساد'' پر گفتگو جواب نمبر ۳ و ۴ میں آرہی ہے۔ اس لیے ہم یہاں صرف دوسری ''وجہِ فساد'' پر بحث کریں گے۔

وصولی اور اجرت کی جہالت پر بحث: اجارہ علی العمل کے صحیح ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کام اور اجرت دونوں کی مقدار معلوم ہو۔ اور یہاں نہ کام کی مقدار معلوم ہے اور نہ ہی اجرت کی۔ کیوں کہ ایک سفیر کی وصولی کتنی ہوگی، اس کا زیادہ سے زیادہ ایک تخمینہ کیا جاسکتا ہے مگر اس کی صحیح میزان وقت عقد نہیں بتائی جاسکتی اور جب صحیح میزان کا علم نہ ہوگا تو اس کا کمیشن مثلاً ۳۰ فی صد بھی معلوم نہ ہوگا اور فقہی مسلمات کے مطابق صرف کام یا اجرت کی مقدار مجہول ہو تو اجارہ ناجائز وفاسد ہوتا ہے تو کمیشن پر وصولی کا یہ اجارہ بدرجۂ اولیٰ ناجائز وفاسد ہوگا کہ یہاں کام اور اجرت دونوں کی مقدار مجہول ونامعلوم ہے۔ درمختار میں ہے:

"تفسُدُ الإجارة بالشّروط المخالفة لمقتضی العقد فکلّ ما أفسَدَ البیعَ یُفسِدها کجھالة ماجور أو أجرة أومدّةٍ أوعملٍ .اھ. (۱)

جو شرطیں تقاضاے عقد کے خلاف ہوں ان سے اجارہ فاسد ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جو شرط بیع کو فاسد کر دیتی ہے وہ اجارہ کو بھی فاسد کر دیتی ہے۔ مثلاً جو چیز اجرت پر دی جائے، اس کا معلوم نہ ہونا یا اجرت کی مقدار یا اجارہ کی مدت یا کام کی نوعیت یا مقدار کا معلوم نہ ہونا (اجارہ کو فاسد کر دیتا ہے)۔ (م ساجد)

یہی وجہ ہے کہ ہمارے فقہاے کرام نے عامل کے حق المحنت کو اجرت کے بجاے ''کفایت''، یعنی ''اعانت بہ قدر گزارہ'' کے نام سے موسوم کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کو اجرت سے خاصی مشابہت حاصل ہے۔

اس کی تشریح مختصراً یہ ہے کہ زکاۃ وغیرہ صدقات کے سرکاری محصل ''عامل'' کو بہ قدرِ عمل حق المحنت دینے کا حکم ہے۔ یعنی اتنی مقدار جو وصولی کے دنوں میں اس کے اور

(۱) الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار، ص:۳۲، ج:۵، أوائل باب الاجارة الفاسدة.

اس کے اعوان وانصار کے اوسط گزارے کے لیے کافی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ مقدار مجہول ہے۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک قول پر عامل کو اس کی وصولی کا (ثُمُن $\frac{1}{8}$) دیں گے۔ جسے آج کی بول چال میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کا کمیشن ساڑھے بارہ فی صد ہوگا اور ظاہر ہے کہ یہ بھی مجہول ہے کیوں کہ جب یہی نہیں معلوم کہ اس کی وصولی کتنی ہوگی تو اس کا کمیشن بدرجۂ اولیٰ نامعلوم ہوگا۔

اس لیے دونوں مذاہب میں عامل کے حق المحنت کو اجرت نہیں مان سکتے۔ کیوں کہ شریعت طاہرہ نے جب اجرت کے مجہول ہونے کی صورت میں عقد اجارہ کو ناجائز وفاسد قرار دیا ہے تو اجرت کی حیثیت سے ''قدرِ عمل'' اور "ثُمن "($\frac{1}{8}$) کی اجازت کیسے دے سکتی ہے۔ لہٰذا یہ اجرت نہیں ہے بلکہ ''کفایت'' ہے جس میں جہالت بھی گوارا کی جاتی ہے۔ امام علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جلیل الشان تصنیف "بدائع الصنائع" میں اس مسئلے کی وضاحت ان الفاظ سے فرمائی:

"وأمّا العاملون علیھا: فھم الّذین نصبھم الامام لجبایة الصّدقات واختلف فیما یُعطَون. قال أصحابُنا: یُعطیھم الإمام کفایتھم منھا. وقال الشافعی: یعطیھم الثُمُن. وجه قوله: أنّ اللّٰه تعالیٰ قسّم الصدقاتِ علی الاصناف الثمانیة. منھم

عاملین سے مراد وہ ہیں جنھیں بادشاہِ اسلام نے صدقات کی وصولی کے لیے مقرر کیا ہو۔ انھیں کتنا دیا جائے اس سلسلے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ احناف کا قول یہ ہے کہ بادشاہِ اسلام انھیں اس میں سے اتنا دے، جو وصولی کے دنوں میں ان کے مناسب گزارے کے لیے کافی ہو۔ اور امام شافعی علیہ الرحمہ کا قول یہ ہے کہ انھیں ان کی وصولی کا آٹھواں حصہ دے۔

امام شافعی علیہ الرحمہ کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صدقات کو آٹھ قسموں میں تقسیم فرمایا

العاملون عليها فكان لهم منها الثُمُن ولنا: ان مايستحقهٗ العامل انما يستحقه بطريق العمالة لا بطريق الزّكاة بدليل أنّه يُعطىٰ وان كان غنيًّا بالإجماع ولو كان ذلك صدقة لماحلت للغني. .... دلّ أنه انما يستحق بعمله لكن علىٰ سبيل الكفاية لهٗ ولأ عوانِهٖ لا على سبيل الأجرة لأنّ الاجرة مجهولة. أمّا عندنا فظاهر لأنّ قدر الكفاية له ولاعوانه غير معلوم، وكذا عنده لأنّ قدر مايجتمع من الصدقات بجبايته مجهول فكان ثُمُنُهٗ مجهولاً لامحالة وجهالةُ أحد البدلين يمنع جواز الاجارة

ہے۔ انھیں میں ایک قسم عاملین کی بھی ہے تو ان کے لیے صدقات کا آٹھواں حصہ ہوگا۔

احناف کی دلیل یہ ہے کہ عامل جو پاتا ہے وہ حق المحنت کی حیثیت سے پاتا ہے، زکاۃ کی حیثیت سے نہیں پاتا ہے اس لیے کہ اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ عامل کو حق المحنت دیا جائے گا اگر چہ وہ مال دار ہو۔ اگر عامل کو ملنے والا مال صدقہ ہوتا تو غنی کے لیے اس کا لینا حلال نہیں ہوتا۔ (اگو کوئی شخص مالِ زکاۃ بذاتِ خود بادشاہِ اسلام کے پاس پہنچا دے تو عامل اس میں سے کچھ نہیں پائے گا) یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عامل وصولی کرنے ہی کی وجہ سے کچھ پانے کا حق دار ہوتا ہے۔ لیکن یہ عامل اور اس کے معاونین کے مناسب خرچ کے لیے ہوتا ہے، بطور اجرت نہیں ہوتا، اس لیے کہ اجرت مجہول ہے۔

اجرت کا مجہول ہونا ہمارے نزدیک بالکل ظاہر ہے، اس لیے کہ وصولی کے دنوں میں عامل اور اس کے معاونین کا کتنا خرچ ہوگا یہ معلوم نہیں ہے اور ایسا ہی امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک بھی ہے۔ اس لیے کہ عامل کی وصولی سے کتنا مال جمع ہوگا، معلوم نہیں ہے تو اس کا آٹھواں حصہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔ اور

فجهالة البدلين جميعا أولى. فدلّ أن الاستحقاق ليس على سبيل الاجرة بل علىٰ طريق الكفاية له ولأعوانه لاشتغاله بالعمل لأصحاب المواشى فكانت كفايته فى مالهم. اھ. ملخصًا. (١)

اگر کام یا اجرت میں سے کوئی ایک مجہول ہو تو اجارہ ناجائز ہوتا ہے، تو جب دونوں مجہول ہوں تو اجارہ بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہوگا۔

اس سے پتہ چلا کہ عامل کا پانا بطورِ اجرت نہیں ہے بلکہ عامل اور اس کے معاونین کے مناسب خرچ کے لیے ہے۔ اس لیے کہ وہ مال داروں کے کام میں مشغول ہے تو اس کا مناسب خرچ انھیں کے مال میں سے ہوگا۔ (م۔ساجد)

اس تفصیل سے یہ امر منقح ہو کر سامنے آ گیا کہ وصولی کا ثُمن یعنی آٹھواں حصہ (١/٨) اجرت مقرر کرنا ناجائز ہے اور اس کی وجہ سے اجارہ فاسد ہوگا۔ لہذا آج کے زمانے میں صدقات کی وصولی پر کمیشن کا رائج اجارہ بھی ناجائز و فاسد ہوگا۔ البتہ وصولی مکمل ہونے کے بعد کام کی مقدار بھی معلوم ہو جاتی ہے اور اجرت بھی، اس لیے اجرتِ مثل سفیر کے حق میں حلال وطیب ہوگی۔ اگر چہ اصل عقد ناجائز و فاسد تھا۔ (٢)

---

(١) بدائع الصنائع، ص:٤٤، ج:٢، فصل وأمّا الذى يرجع إلى المؤدّىٰ اليه من كتاب الزكوٰة

(٢) فتاوىٰ رضویہ میں پراویڈنٹ فنڈ کے تعلق سے ہے:

شرعاً اگر چہ یہ صورت اجارۂ فاسدہ ہے کہ ایک جز و اجرت ایک مدت مجہولہ کے لیے مؤجل کیا گیا، کیا معلوم کہ ختم ملازمت کب ہو اور اجل مجہول سے مؤجل کرنا مفسد بیع و اجارہ ہے جس کے سبب عقد فاسد و گناہ ہو جاتا ہے،......... رد المحتار میں ہے:

فى الزاهدى باعهٗ بثمنٍ نصفهٗ نقدٌ ونصفهٗ اذا رجع من بلد كذا فهو فاسد ، مگر اجارۂ فاسدہ میں بھی بعد استیفاے منفعت، اجرت کہ یہاں وہی اجر مثل ہے، واجب ہو جاتی ہے، اور وہ اجیر کی ملک ہے۔ درمختار میں ہے:

حكم الفاسد وجوب اجر المثل بالاستعمال، بلکہ منیہ وقنیہ و جامع الرموز و محیط و غرر الافکار وغیرہا کی رو سے اس ملک میں خبث بھی نہیں ہوتا۔ اجیر کے لیے طیب ہوتی ہے اگر چہ اصل عقد گناہ و فاسد تھا۔ رد المحتار میں ہے:

(باقی اگلے صفحہ پر)

فساد سے بچنے کی صورتیں

یہاں فسادِ عقد سے بچنے کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(الف) پہلی صورت یہ ہے کہ کمیشن پر وصولی کو عقد اجارہ نہ مانا جائے بلکہ اسے بھی ''کفایت واعانت'' قرار دیا جائے جیسا کہ عامل کے حق المحنت کو کفایت واعانت قرار دیا گیا ہے۔

مگر یہ توجیہ اس لیے ناقابل قبول ہے کہ عامل کو قرآن حکیم نے زکاۃ کے مصارف سے شمار کیا ہے اور اسے مالِ زکاۃ دینے کی اجازت دی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے: ''وَالْعَامِلِیْنَ عَلَیْهَا'' اس لیے اسے ایسے نام وعقد سے موسوم کریں گے جو شریعت کے اصول وفروع سے متصادم نہ ہو۔

اس کے برخلاف مدارس کے سفرا شرعی نقطۂ نظر سے ''عامل'' نہیں ہیں، نہ ہی کتاب وسنت میں انھیں زکاۃ کے مصارف سے شمار کیا گیا ہے اور نہ ہی ان کے لیے حق المحنت کی اجازت دی گئی ہے۔ اس لیے مدارس اور سفرا کے باہمی معاہدہ کو عقد اجارہ نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ جب کہ اس پر اجارہ کی تعریف پورے طور پر صادق آرہی ہے۔

(ب) فسادِ عقد سے بچنے کی ایک صورت یہ بتائی گئی ہے کہ مدارس دینیہ کی بقا، استحکام اور فروغ کے لیے کمیشن پر چندہ کی ضرورت شرعیہ پائی جاتی ہے مگر حضرت مفتی اعظم ہند علامہ شاہ مصطفیٰ رضا نوری علیہ الرحمۃ والرضوان ضرورت کے تحقق کا انکار فرماتے تھے۔ آپ کی دلیل یہ تھی کہ مدرسہ مظہر الاسلام مسجد بی بی جی بریلی شریف چندے سے ہی چلتا ہے مگر اس کے لیے کسی کو کمیشن نہیں دیا جاتا۔ بعض اکابر مفتیان

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) الاجر یطیب وان کان السبب حرامًا کما فی المنیة. قهستانی الخ ونقل مثلهٗ السیّدُ الحموی فی غمز العیون عن القنیة ثم عقبه بقوله: لم یذکر وجهٗ فلینظر اه. وذکر الشامی عن منح الغفار. ان شمس الأئمة الحلوائی قال: تطیب الاجرة الفاسدة اذا کان اجر المثل. وذکر فی المسئلة قولین واحدهما اصح فراجع نسخة صحیحة. اه. (فتاویٰ رضویہ، ص:۱۸۳ ج:۸، سنی دار الاشاعت، مبارک پور)

عظام سے ہم نے گفتگو کی تو انھوں نے بھی ضرورت کا انکار فرمایا۔ خود راقم الحروف کا موقف یہی ہے کہ ضرورت نہ پہلے تھی نہ اب ہے، کیوں کہ ضرورت کا مطلب یہ ہے کہ چندہ کمیشن پر نہ کرایا جائے تو مدرسہ بند ہو جائے یا بند ہونے کے قریب پہنچ جائے، یعنی جاں کنی کی حالت میں ہو جائے۔ حالاں کہ واقعہ اس کے خلاف ہے کیوں کہ عطیات کی خطیر رقم تو یوں جمع ہو جاتی ہے کہ اس پر شاید وباید کچھ صرفہ آئے، اس میں منی آرڈر، چیک، چرم قربانی اور مخلصین کے ذریعہ وصول ہونے والی رقوم شامل ہیں۔ کرایہ املاک، چٹکی اور تنخواہ پر وصول ہونے والا چندہ بھی مناسب مقدار میں جمع ہو جاتا ہے۔ اور اب تو بہت سے اساتذہ وملازمین کی تنخواہ کا بارِ گراں حکومت نے اٹھا لیا ہے۔ پھر جو لوگ کمیشن پر وصولی کرتے ہیں انھیں اگر دینی ضرورتوں اور خوفِ خدا کا احساس دلا کر تنخواہ پر بھیجا جائے تو ان کی جد وجہد سے بھی ایک خطیر رقم جمع ہوگی۔ گو کمیشن کی بہ نسبت کم ہوگی تو یہ تمام رقوم کفایت شعاری سے مدرسہ چلانے کے لیے کافی ہوں گی۔ اس لیے ضرورت شرعیہ کا تحقق تو یقیناً نہیں ہے۔

ممکن ہے کچھ اکابر علما کی مراد لفظ ضرورت سے اس کا حقیقی مفہوم نہ ہو، بلکہ ''حاجت'' ہو تو اس سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ حاجت کا مطلب یہ ہے کہ مدرسہ چل تو سکتا ہے مگر اس کے لیے مشقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جیسے گھر میں روشنی نہ ہو تو رات گزر سکتی ہے مگر وہ رات حرج ومشقت کی رات ہوگی۔ اسی لیے فقہا نے چراغ کو حاجت سے شمار کیا ہے۔ حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے کہ حضرت مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مرجع خلائق تھے۔ کثرت سے آپ کے مدرسہ کے لیے منی آرڈر آتے، پھر بھی آپ کا مدرسہ مقروض رہتا۔ ظاہر ہے کہ جس مدرسہ کے لیے ایسے عظیم وسائل مہیا نہ ہوں وہ ضرور حرج ومشقت سے دوچار رہے گا۔

پھر اس حیثیت سے غور فرمایئے کہ ہر مسلم آبادی میں چار پانچ علما کی ضرورت یقیناً ہے، مگر ہماری بیشتر آبادیاں ابھی تک اس سعادت سے محروم ہیں اور آج بھی

ہمارے درمیان اہل علم کی بہ نسبت ناخواندہ افراد کی تعداد بہت زیادہ ہے جب کہ ہر مسلمان مرد وعورت پر دین کے ضروری مسائل کا سیکھنا فرضِ عین ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارے یہاں مکاتب ومدارس کی تعداد آج بھی کم ہے۔ پھر ہر مکتب ومدرسہ میں باصلاحیت اساتذہ موجود نہیں، جہاں ہیں وہاں بھی بہ قدر حاجت نہیں، کتنے مدارس ہیں جو آج بھی کس مپرسی کے عالم میں چل رہے ہیں، ایک تو اساتذہ کی تنخواہیں کم، وہ بھی آٹھ آٹھ، دس دس ماہ تک اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کہیں سے دست غیب آئے تو کچھ کام چلے۔ طلبہ کی تعداد بھی کم سے کم ہوتی ہے اور اعلیٰ تعلیم وتحقیق اور دوسرے اہم شعبہ جات کے لیے جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ صرف کرایۂ املاک اور فی سبیل اللہ کام کرنے والوں کی وصولی سے پوری نہیں کی جاسکتی اور زیادہ سے زیادہ کمیشن حاصل کرنے کے لیے محصلین شب وروز محنت کر کے جو سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں وہ ایک حد تک کفایت کرتا ہے۔ اس لیے کمیشن پر چندہ کرانے کی حاجت شرعیہ پائی جاتی ہے جو باعث تخفیف ہے۔

کام اور اجرت کی مقدار کی جہالت کی وجہ سے جو شرعی مخدور لازم آتا ہے وہ حاجت کی وجہ سے مباح ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ فقہاے کرام نے دلال ومنادی اور حمام کے نگراں وغیرہ کے اجارے کو اس طرح کی جہالت کے باوجود جائز قرار دیا ہے۔

درمختار کتاب الاجارہ میں ہے:

"مَا أفْسَدَ الْبَيْعَ يُفْسِدُهَا كجهالةِ ماجورٍ أو أجرةٍ أو مدةٍ أو عملٍ." اھ.

جو شرط بیع کو فاسد کرتی ہے وہ اجارہ کو بھی فاسد کرتی ہے۔ مثلاً جو چیز اجرت میں دی جائے اس کا معلوم نہ ہونا یا اجرت کی مقدار یا اجارہ کی مدت یا کام کی نوعیت معلوم نہ ہونا (اجارہ کو فاسد کر دیتا ہے) (م ساجد)

اس کے تحت ردالمحتار میں ہے:

"(قوله: أو مُدّةٍ) إلاّ فيما اسْتُثْنِيَ. قال في البزازية: اجارةُ السّمسار والمنادي والحمامي والصّكّاك ومالا يُقدر فيه الوقت ولاالعمل تجوز لما كان للنّاس به حاجة ويطيب الاجرُ الماخوذ لوقدر أجر المثل اھ.[1]

درمختار میں ہے: اجارہ کی مدت معلوم نہ ہو (تو اجارہ فاسد ہو جاتا ہے) لیکن بعض چیزیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ فتاویٰ بزازیہ میں ہے: دلال، منادی، حمام کے نگراں، چک لکھنے والے اور ایسی چیزوں کا اجارہ جس میں وقت اور عمل کی تعیین نہیں ہوتی ہے جائز ہے اس لیے کہ لوگوں کو اس کی حاجت ہے۔ اور اس کی اجرت اگر اتنی ہو جو اس جیسے کاموں کی عموماً ہوتی ہے تو طیب وحلال ہے۔ (م ساجد)

(ج) اور اب تو عامۂ مدارس میں اس کا عرف عام وتعامل بھی ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس حیثیت سے بھی کمیشن پر وصولی کا اجارہ جائز ہوگا۔ جیسے دلال کی اجرت اخراجات کا دس فی صد مقرر ہوئی تو یہ اصالۃً ناجائز ہے اور بوجہ تعامل جائز ہے۔

رد المحتار میں ہے:

"(تتمّة) قال في التاتر خانية: وفي الدّلاّل والسّمسار يجب أجرُ المثل وماتواضعوا عليه أنّ في كل عشرة دنانير كذا فذاك حرام عليهم. وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السّمسار فقال: أرْجُو أنه لابأس به وان كان في

فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے: دلال کے اجارہ میں اجرت مثل واجب ہے۔ اور جو انھوں نے طے کر لیا کہ اتنا فی صد لیں گے، دیں گے وہ ان کے لیے حرام ہے۔ حاوی میں ہے کہ محمد بن سلمہ سے دلال کی اجرت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: میری سمجھ سے اس میں کوئی حرج نہیں ہے اس لیے کہ یہ اصل کے لحاظ سے اگرچہ فاسد ہے لیکن اب اس پر لوگوں کا تعامل

(۱) رد المحتار على الدرّ المختار، ص:۳۲، ج:۵، باب الإجارة الفاسدة.

الاصل فاسدًا لكثرة التعامل. وكثير من هذا غير جائز فجوزوه لحاجةِ النّاس اليه كدخول الحمام." اھ.(۱)

عام ہو چکا ہے اور اس قسم کی بہت سی صورتیں اصل کے لحاظ سے ناجائز ہیں لیکن فقہا نے ان کو لوگوں کی حاجت کے پیش نظر جائز قرار دیا ہے۔ جیسے حمام میں غسل کا اجارہ۔(م.ساجد)

خلاصہ کلام یہ کہ:

(۱) کمیشن پر صدقات وعطیات کی وصولی کا معاہدہ عقد اجارہ ہے جو کام اور اجرت کی مقدار مجہول ہونے کی وجہ سے ناجائز وفاسد ہے۔

(۲) مگر اب اس اجارے کی حاجت شرعیہ متحقق ہو چکی ہے۔ ساتھ ہی اس کا تعامل بھی مدارس کی دنیا میں عام ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے اب اس کی اجازت ہونی چاہیے۔ جیسے اسی وجہ سے دلال وغیرہ کے اجارے کی اجازت ہے۔ اور اب تو بہت سے شعبہ جات میں کمیشن پر کام کرانے کا معاملہ رائج ہو چکا ہے۔ جیسے مساجد، مدارس وغیرہ کی تعمیرات کا ٹھیکہ، دینی کتابوں، رمضان المبارک اور عید الاضحیٰ اور جلسے وجلوس کے اشتہارات کی طباعت پر کمیشن، گاڑیوں کی بکنگ اور کتابوں کی فروختگی پر کمیشن اور ان کے علاوہ دوسرے کاموں پر بھی کمیشن کا رواج ہو چکا ہے۔

جواب (۲-الف) چندے کے کمیشن میں قفیز طحان کا جو معنی پایا جاتا ہے اس کی اباحت کے لیے آج بھی ضرورت شرعیہ نہیں پائی جاتی۔ کیوں کہ اس کے بغیر بھی مدرسہ ایک محدود دائرے میں رہ کر چلایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں مختصراً واضح کیا گیا۔

(ب) علاوہ ازیں معنی قفیز طحان کی اباحت کے لیے ضرورت شرعیہ کا تحقق ضروری نہیں۔ بلکہ حاجت شرعیہ کا تحقق بھی کافی ہے۔ جیسا کہ درج ذیل

(۱) رد المحتا، ص:٤٤، ج:٥، باب ضمان الاجير.

جزیات سے عیاں ہے۔

در مختار میں ہے:

"وفى الأشباه فى أواخر قاعدة "العادةُ مُحَكَّمَة" عن المنية: لو دفع غزلا إلى حائك لينسجه بالنصف جوزه مشائخ بخارى للعرف. ثم نقل فى آخرها عن اجارة البزازية: أن به أفتى مشائخ بلخ وخوارزم وأبوعلى النسفى أيضا، قال: والفتوىٰ على جواب الكتاب (أى المبسوط للامام محمد وهو المسمّٰى بالأصل) للطحّان (أى لمسئلة قفيز الطحّان) لانه منصوص عليه فيلزم ابطال النص." اھ.(۱)

اشباہ میں قاعدہ "العادة مُحَكَّمَة" کے اواخر میں منیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر کسی نے کپڑا بننے والے کو سوت دیا کہ اس سے کپڑا بنے اور آدھا کپڑا اجرت میں لے لے تو مشائخ بلخ نے اس کو عرف کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے۔ پھر اسی قاعدے کے آخر میں فتاویٰ بزازیہ کتاب الاجارہ سے نقل فرمایا کہ اسی پر بلخ اور خوارزم کے مشائخ اور امام ابوعلی نسفی کا بھی فتویٰ ہے۔ امام نسفی نے فرمایا کہ قفیز طحان کے مسئلے میں فتویٰ امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب مبسوط جس کو "اصل" بھی کہتے ہیں کے جواب پر ہے اس لیے کہ یہ مسئلہ منصوص علیہ ہے تو (اس کے خلاف حکم دینے میں) نص کا ابطال لازم آئے گا۔(م.ساجد)

رد المحتار میں ہے:

"(قوله لانّه منصوص) أى عدم الجواز منصوص عليه بالنهى عن قفيز الطّحان ودفع الغزل الى

در مختار کی عبارت "لأنه منصوص عليه" کا مطلب یہ ہے کہ قفیز طحان کا ناجائز ہونا صاف حدیث پاک سے ثابت ہے۔ اور کپڑا بننے والے کو سوت دینا (کہ اس سے کپڑا بنے اور

(۱) الدر المختار علىٰ هامش رد المحتار، ص:۱۷۷، ج:٤ أخرُ باب الصّرف من كتاب البيوع.

حائك في معناه. قال البيرى: والحاصل: أنّ المشائخ أرباب الاختيار اختلفوا في الافتاء في ذلك. قال في العتابية: قال أبو الليث: النسج بالثُلث والرُّبع لايجوز عند علمائنا، لكن مشائخ بلخ استحسنوه وأجازوه لتعامل الناس. قال: وبه نأخذ.

قال السيد الامام الشهيد: لانأخذ باستحسان مشائخ بلخ وانما نأخذ بقول اصحابنا المتقدمين لان التعامل في بلد لايدل على الجواز مالم يكن على الاستمرار من الصدر الاول فيكون ذلك دليلا على تقرير النبي صلى الله عليه وسلم اياهم على ذلك فيكون شرعاً منه فاذا لم يكن كذلك لايكون فعلهم حجة الا اذا كان كذلك من الناس كافة في البلدان كلها فيكون اجماعا والاجماع حجة

آدھا کپڑا اجرت میں لے لے) قفیز طحان کے معنی میں ہے۔

علامہ بیری نے فرمایا: حاصل یہ ہے کہ اصحاب اختیار مشائخ کے فتاویٰ اس سلسلے میں مختلف ہیں۔ عتابیہ میں ہے: فقیہ ابو اللیث نے فرمایا: تہائی اور چوتھائی کے بدلے کپڑا بننا ہمارے علما کے نزدیک ناجائز ہے۔ لیکن مشائخ بلخ نے اسے بہتر سمجھا اور لوگوں کے تعامل کی وجہ سے اس کی اجازت دے دی۔

اور فرمایا ہم بھی اسی کو اختیار کرتے ہیں۔

سید امام شہید نے فرمایا: ہم مشائخ بلخ کے استحسان کو نہیں اپناتے بلکہ اپنے اصحاب متقدمین کا قول اختیار کرتے ہیں اس لیے کہ کسی ایک شہر کا تعامل جواز کی دلیل نہیں ہے۔ ہاں! اگر وہ تعامل سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے سے لگاتار جاری ہو تو اس بات کی دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اس عمل پر برقرار رکھا لہٰذا وہ جائز ہوگا۔ لیکن جب یہ صورت نہ ہو تو کسی ایک شہر کے لوگوں کا عمل درآمد جواز کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ یا وہ تمام شہروں کے تمام لوگوں کا تعامل ہو جائے تو اس صورت میں اجماع ہو جائے گا اور اجماع دلیل شرعی

الاترى! أنهم لوتعاملوا على بيع الخمر والربا لا يفتى بالحل. اه."(1)

ہے کیا آپ کو نہیں معلوم کہ اگر شراب کی بیع اور سود پر لوگوں کا تعامل ہو جائے تو ان کے حلال ہونے کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔ (م ساجد)

اور حضرت امام شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جو یہ فرمایا کہ قفیز طحان اور اس کے ہم معنی عقود کے تعلق سے تعامل کا اعتبار نہیں ہے اور وہ دلیل جواز نہیں بن سکتا کیوں کہ یہ تعامل نہ تو عہد رسالت سے ہے کہ اسے نبی کریم ﷺ کا برقرار رکھنا کہا جائے اور نہ ہی یہ تمام بلاد اسلامیہ کا تعامل ہے جو اجماع امت قرار پائے۔

اس کے تعلق سے عرض ہے کہ فقیہ فقید المثال اعلیٰ حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمۃ والرضوان نے اپنے رسالہ "المنی والدرر لمن عمد منی آرڈر" میں پوری تحقیق کے ساتھ روز روشن کی طرح یہ واضح فرما دیا ہے کہ تعامل کے حجت ہونے کے لیے نہ تو عہدِ رسالت سے اس کا وجود ضروری ہے اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ وہ جمیع بلاد اسلامیہ کا تعامل ہو، بلکہ صرف ایک دور کا "تعامل عام" ہونا کافی ہے۔

ہم یہاں فتاویٰ رضویہ کے رسالۂ مذکورہ سے بطور شہادت چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ امام موصوف رقم طراز ہیں:

"کیا لازم ہے کہ وہ عرف زمانِ اقدس حضور پر نور سید المرسلین ﷺ سے واقع ہو۔ أقول بعض علما کی تقریر میں ایسا واقع ہوا۔ "ليجعله من تقرير النبي صلى الله تعالى عليه وسلم." مگر حق یہ کہ یہ ہرگز ضروری نہیں۔ ہزارہا فروع مذہب وصدہا کلماتِ ائمہ اس کے خلاف پر شاہد ہیں۔"(2)

اس کے بعد آپ نے اپنے موقف کے ثبوت میں تیس کتب معتمدہ سے تیس مسائل نقل کیے ہیں۔ پھر تحریر فرمایا ہے کہ:

(1) رد المحتار، ص:٢٧٧، ج:٤، باب الصرف من كتاب البيوع، قبيل كتاب الكفالة.

(2) فتاوی رضویه، ص:٢٠٥، ج:٨، سنی دار الاشاعت.

''قطع نظر اور مسائل سے یہ اور ان کے امثال کثیرہ سب بر خلاف اصل وقیاس ہیں جنھیں ائمہ کرام وعلماے اعلام نے تعامل وعرف پر مبنی فرمایا۔ اب کیا کوئی ثابت کرسکتا ہے کہ ان باتوں کا تعامل زمانۂ اقدس حضور پرنور سید عالم ﷺ سے ہے۔ حاشا للہ ثم حاشاللہ وان طلب کلٌ طلبِ لاَعْیاہ. بھلا کھڑاؤں کا پہننا ہی زمانۂ اقدس سے ثابت کرے۔ مصحف وکتب کہاں تھیں کہ وقف ہوتے، آٹے میں تول کب تھی اور مساجد میں قندیلیں لٹکانے کی زنجیریں کب تھیں۔

تبدیل کیل ووزن تو خود عرفِ حادث ہی میں کلام ہے جس کا غیر ستہ (گیہوں، جو، کھجور، نمک، سونا، چاندی کے سوا) میں اعتبار تو مجمع علیہ (اجماعی) اور ستہ (مذکورہ چھ چیزوں) میں امام ثانی (امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کے نزدیک جسے محقق علی الاطلاق نے ترجیح دی، اور در بارۂ مسائل اوقاف تو عبارات مذکورہ درمختار وخلاصہ وفتح القدیر وعالم گیریہ وفتاویٰ ظہیریہ ونہر الفائق ومنح الغفار وغیرہ نص صریح ہیں کہ یہ سب عرفِ حادث ہیں، یہاں تک کہ ان میں بہت باتیں زمانۂ امام محمد کے بعد پیدا ہوئیں۔ بالجملہ ان جزئیات میں دلیل قائم ہے تو حدوث پر، قدم تو کوئی ثابت کر ہی نہیں سکتا۔ اھ ملخصاً''(1)

نیز رقم طراز ہیں:

''کیا ضروری ہے کہ وہ عرف تمام جہان کے تمام مسلمانوں کو محیط وشامل ہو

اقول: بعض علما کے کلام سے ایسا مُترشح لیجعله من باب الاجماع مگر حق یہ ہے کہ نہ یہ اصلاً لازم نہ کلماتِ سائر ائمہ کرام، سلف خلف علماے اعلام اس کے ملائم بلکہ صراحۃً اس کے خلاف پر قاضی وحاکم **اولاً:** ابھی تحریر الاصول امام ابن الہمام و بحر الرائق ورد المحتار سے گزرا:

"التعامل هو الاكثر استعمالا ." تعامل وہ ہے جس کا عمل درآمد زیادہ ہو۔ (ن.)

(1) فتاوی رضویه، ص:۲۰۵-۲۰۹، ج:۸، سنی دار الاشاعت، مبارک پور۔

الاشباہ والنظائر میں ہے:

"انما تعتبر العادة اذا اطردت او غلبت ." عادت اس وقت معتبر ہے جب وہ رائج یا غالب ہو۔ (ن.)

ثانیاً: انھیں مسائل مذکورہ کو دیکھئے جن میں علماے مذہب نے محل عرف وتعامل مانا کیا کوئی ثابت کرسکتا ہے کہ تمام بلاد کے تمام عباد کا یہی عرف ہے۔ بھلا کھڑاؤں کہاں کہاں پہنی جاتی ہے، پٹھے دار کہاں کہاں ہوتی ہے، اون کی ٹوپی کہاں کہاں بنی جاتی ہے، ایک دے کر دوسری اس کے ساتھ کی کہاں کہاں بنی ہے۔ کلہاڑی، بسولا، آرا، پھاوڑا، چارپائی، چادر، گھڑے، لوٹے، دیگ، دیگچی، طشت، دودھ، دہی کے لیے گائے، بیج کے لیے غلہ، قرض کے لیے روپیہ کہاں کہاں وقف ہوئے ہیں۔ الی غیر ذلك مما لا یخفی.

''حاشا للہ یہ اگر عرف وتعامل حقیقتاً اجماع کل مسلمانانِ ہند در کنار اتفاقِ اکثر مومنین جمیع بلاد ہی مرادِ علما ہوتا تو مسئلہ کا مستحیل ہو جاتا اور اس کی بنا پر حکم ناممکن رہتا۔ زمانۂ مشائخ کرام میں بحمد اللہ تعالیٰ اسلام مغاربِ ارض سے مشارق تک پھیل چکا تھا، مسلمان اقطار وآفاق میں آباد تھے، کوئی شخص ان بلاد وقریٰ وشعاب وجبال کی گنتی بھی نہ بتا سکتا، جہاں جہاں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پکارا جاتا تھا، جل جلالہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چہ جائے آں کہ مسلمانوں کا شمار چہ جائے آں کہ ان سب کے عمل وعرف پر اطلاع اور بغیر اس کے کسی کام میں حکم لگانا کہ عامۂ بقاع کے جمہور مسلمین کا عرف یوں ہے۔ قطعاً محال تو کسی مسئلہ کو عرف وتعامل پر بنا کرنا ہی ممتنع ہوتا، سبحان اللہ اجماع شرعی جس میں اتفاق ائمہ مجتہدین پر نظر تھی، علما نے تصریح فرمائی کہ بوجہ شیوع وانتشار علما فی البلاد دو صدی کے بعد اس کے ادراک کی کوئی راہ نہ رہی۔ جب صرف مجتہدین کا اتفاق معلوم نہیں ہوسکتا تو عرف وتعامل جس میں اجتہاد در کنار علم بھی درکار نہیں علما و جہلا سب کا

عمل درآمد ملحوظ ہے۔ اس میں اتفاق کل کیا معنی۔ اتفاق اکثر کا علم بھی بہ درجۂ اولیٰ محال و ناممکن ہے کہ آخر اکثر کل کل علما سے ضرور اکثر ہے۔‘‘(۱)

نیز فرماتے ہیں:

’’بالجملہ بحمد اللہ تعالیٰ بہ دلائل قاطعہ واضح ہوا کہ علمائے کرام جس عرف کو فرماتے ہیں کہ قیاس پر قاضی ہے اور نص اس سے متروک نہ ہوگا، مخصوص ہوسکتا ہے وہ یہی عرف حادث شائع ہے کہ بلاد کثیرہ میں بہ کثرت رائج ہو، نہ عرف قدیم زمان رسالت علیہ افضل الصلوٰۃ والتحیۃ، نہ عرف محیط جمیع عباد تمام بلاد۔‘‘(۲)

محقق بے مثال اعلیٰ حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمۃ والرضوان کی اس تحقیق انیق سے روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا کہ تعامل کے حجت ہونے کے لیے صرف اتنا ضروری ہے کہ وہ عام ہو، صدر اول سے ہونا، یوں ہی تمام بلاد اسلامیہ میں پایا جانا ضروری نہیں۔ اس لیے مشائخ بخاری، بلخ، خوارزم اور قاضی ابو علی نسفی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین نے تعامل کی وجہ سے بعض مسائل قفیز طحان میں جواز بلکہ استحسان کا جو موقف اختیار کیا ہے وہ حق و درست ہے۔

جب یہ ثابت ہوگیا کہ نصف یا رُبع یا ثُلُث کپڑے کے بدلے میں دھاگہ دے کر کپڑا بنوانا جو حکم قفیز طحان میں ہے تعامل کی وجہ سے جائز ہے تو کمیشن پر صدقات وعطیات کی وصولی بھی جو قفیز طحان کے حکم میں ہونے کی وجہ سے ناجائز قرار دی گئی تھی، اب جائز ہونی چاہیے۔

ایک اشکال: مشائخ بلخ وغیرہ کے استدلال کا حاصل یہ تھا کہ ’’قفیز طحان‘‘ تو نص حدیث کی وجہ سے ناجائز ہے اور دھاگہ دے کر نصف کپڑے کے بدلے کپڑا بنوانا نص پر قیاس کی وجہ سے یا نص کے معنی (کام کے ایک جز کو اجرت مقرر کرنا)

(۱) فتاوی رضویہ، ص:۲۰۹-۲۱۰، ج:۸، رسالہ المنی والدرر، سنی دار الاشاعت مبارک پور۔
(۲) فتاوی رضویہ، ص:۲۱٤، ج:۸، رسالہ المنی والدرر، سنی دار الاشاعت، مبارک پور۔

میں ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے اور تعامل کی وجہ سے قیاس متروک اور نص مخصوص ہوجاتا ہے۔ اس لیے یہ اجارہ جائز ہوا۔

اس پر ایک اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ یہ تعامل ایک شہر کا ہے اور ایسے تعامل سے نہ قیاس متروک ہوتا ہے، نہ نص مخصوص۔ رد المحتار میں ہے:

"قال فی التبیین: ومشائخ بلخ والنّسفی یجیزون حمل الطعام ببعض المحمول ونسج الثوب ببعض المنسوج لتعامل اهل بلادهم بذلك ومن لم یجوزه قاسه علی قفیز الطحان والقیاس یترك بالتعارف. ولئن قلنا: إنهٗ لیس بطریق القیاس بل النصُّ یتناولهٗ دلالةً، فالنصُّ یخص بالتعارف. ألاتری أن الاستصناع ترك القیاس فیه وخُصّ من القواعد الشرعیة بالتّعامل. ومشایخنا رحمهم اللّٰه لم یجوزوا هذا التخصیص لان ذلك تعاملُ أهل بلدة واحدةٍ وبه لایخص الأثر بخلاف الاستصناع

تبیین میں ہے کہ مشائخ بلخ اور امام نسفی فرماتے ہیں کہ: غلہ ڈھونا اور اسی میں سے کچھ غلہ مزدوری لینا یا کپڑا بننا اور اسی میں سے کچھ کپڑا مزدوری لینا جائز ہے اسی لیے کہ ان کے دیار میں اس کا تعامل ہے۔ اور جس نے اس کو ناجائز کہا اس نے قفیز طحان پر قیاس کیا ہے اور قیاس تعامل کی وجہ سے ترک کردیا جاتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ یہ مسئلہ قیاس سے نہیں بلکہ دلالت النص سے ثابت ہے تو (جواب ہوگا کہ) نص تعامل سے مخصوص ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ مسئلہ استصناع میں تعامل کی وجہ سے قیاس کو ترک کردیا گیا اور قواعد شرعیہ سے خاص کرلیا گیا ہے۔ ہمارے مشائخ اس تخصیص کو ناجائز کہتے ہیں اس لیے کہ وہ ایک شہر کا تعامل ہے اور اس سے اثر (نص) مخصوص نہیں ہوسکتا، برخلاف مسئلہ استصناع کے کہ

فانّ التعامل به جری فی کل البلاد وبمثله یترك القیاس ویخص الأثر. اھ."(۱)	اس کا تعامل تمام شہروں میں جاری ہے اور اس جیسے تعامل سے قیاس متروک اور اثر مخصوص ہو جاتا ہے۔(م.ساجد)

اشکال کا حل (الف): یہ حق ہے کہ ایک دو شہر کا تعامل ایسا برہان قوی نہیں ہے کہ اس کے باعث حدیث کا نصِ عام خاص اور قیاس متروک ہو جائے، یہ تاثیر تعاملِ عام کی ہوتی ہے جو بلاد کثیرہ کے عوام و خواص کا عمل درآمد ہوتا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ تعامل ایک شہر کا نہ تھا بلکہ بلادِ کثیرہ کا تھا۔ جیسا کہ تبیین کے الفاظ: "لِتَعَامُلِ اَهْلِ بِلَادِهِمْ." سے ظاہر ہے۔ علاوہ ازیں منیہ، بزازیہ اور اشباہ کے حوالہ سے درمختار اور فتاویٰ عتابیہ وغیرہ کے حوالے سے ردالمحتار کی جو عبارات ہم نے استدلال میں نقل کی ہیں ان میں صراحت ہے کہ یہ تعامل بخاری، بلخ، خوارزم، اور نسف[(۲)] کا تھا۔ ظاہر ہے چار چار بلاد کا تعامل بلادِ کثیرہ کا تعامل ہے جو عام ہے، خاص نہیں ہے کیوں کہ خاص ایک دو شہر کا تعامل ہوتا ہے۔

فتاویٰ رضویہ رسالہ المنی والدرر میں ہے:

"علمائے کرام جس "عرف عام" کو فرماتے ہیں کہ قیاس پر قاضی ہے اور نص اس سے مخصوص ہو سکتا ہے وہ یہی عرفِ حادث شائع ہے کہ بلادِ کثیرہ میں بہ کثرت رائج ہو۔ ہاں عرف خاص کہ صرف دو ایک شہر کے لوگوں کا تعارف ہو، مذہب ارجح میں صالحِ تخصیص نص و ترکِ قیاس نہیں۔"(۳)

نیز اسی میں ہے:

(۱) ردالمحتار، ص:۴۰–۴۱، ج:۵، باب الاجارۃ الفاسدۃ.

(۲) نَسَف یہ ماوراء النہر کے ایک شہر کا نام ہے۔ ایسا ہی فوائد بہیہ ص:۱۰۳ میں ہے۔ اور قاضی ابو علی نسفی کا نام حسین بن خضر ہے۔ آپ امام عصر تھے۔ الفوائد اور الفتاویٰ آپ کی تصانیف سے ہیں۔ ۴۲۴ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ فوائد بہیہ ص:۱۳۱-۱۲۱ منہ حفظہ ربہ.

(۳) فتاویٰ رضویہ، ص:۲۱۴، ج:۸، سنی دار الاشاعت، مبارک پور.

"ائمہ کرام و مشائخ اعلام نے ہمیشہ لاجرم اپنے ہی قطر کے بلادِ کثیرہ میں عمل غالب کا نام عرف و تعامل رکھا۔"(۱)

ممکن ہے جن مشائخ کرام نے "ذٰلِكَ تَعَامُلُ اَهْلِ بلدةٍ واحدةٍ." فرمایا انھیں دوسرے بلاد کے تعامل کی اطلاع نہ ملی ہو، بلکہ یہی ظاہر ہے، ورنہ وہ کبھی اسے ایک شہر والوں کا تعامل نہ فرماتے۔

(ب): اور یہاں جس مسئلے میں تعامل پر گفتگو ہو رہی ہے اس میں تعامل ضرور عام ہے، کیوں کہ کمیشن پر چندہ کی وصولی صرف ایک دو مدرسہ کا تعامل نہیں ہے بلکہ یہ عامۂ بلاد کے عامۂ مدارس کا تعامل ہے جس میں عوام و خواص سبھی شریک ہیں۔ اس لیے کمیشن پر چندہ حکمِ قفیز طحان میں ہونے کے باوجود جائز ہونا چاہیے۔

ایک خلجان کا ازالہ: ردالمحتار میں ہے:

" وفی العنایة: فإن قیل لانترکهٗ بل نَخُصّ عن الدلالة بعض مافی معنی قفیز الطحّان بالعرف کما فعل بعض مشائخ بلخ فی الثیاب لجریان عرفهم بذلك. قلت: الدّلالةُ لاعموم لها حتی تخص. اھ."(۲)	عنایہ میں ہے: اگر یہ کہا جائے کہ ہم اس کو ترک نہیں کرتے ہیں بلکہ تعامل کی وجہ سے دلالت النص سے ایسی بعض چیزوں کو خاص کر لیتے ہیں جو قفیز طحان کے معنی میں ہیں۔ جیسا کہ مشائخ بلخ نے اپنے دیار کے تعامل کی وجہ سے کپڑے (بننے) کے مسئلے میں کیا ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیں گے کہ دلالت النص میں عموم ہی نہیں ہوتا کہ اسے خاص کیا جائے۔(م.ساجد)

(۱) فتاویٰ رضویہ، ص:۲۱۱، ج:۸، سنی دار الاشاعت، مبارک پور.

(۲) ردالمحتار، ص:۴۱، ج:۵، باب الاجارۃ الفاسدۃ.

ممکن ہے کہ کسی کو اس عبارت سے یہ خلجان واقع ہو کہ مشائخ بلخ کی بات باوزن نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس کا ازالہ کردینا چاہتے ہیں کہ مشائخ بلخ نے جو اعتراض فرض کرکے جواب دیا ہے اس کا جواب صاحب عنایہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے دیا ہے اور وہی جواب صاحب در مختار نے بھی اس مقام پر دیا ہے۔ مگر ہمارے استدلال کی بنیاد اس سوال وجواب پر نہیں ہے، نہ ہم اس کے قائل ہیں۔ ہماری گفتگو کا محور صرف یہ امر ہے کہ یہاں تعامل متحقق ہو چکا ہے جو اس طرح کے مسائل میں مؤثر ہوتا ہے اور اس کے لیے مشائخ بلخ، بخاری وخوارزم وغیرہ سے استناد کیا ہے۔

علاوہ ازیں ممکن ہے مشائخ بلخ نے تخصیص کا اطلاق مجازاً کیا ہو اور مراد یہ ہو کہ دلالۃ النص میں نص کا معنی التزامی علت نص ہوا کرتا ہے تو جہاں تعامل کی وجہ سے وہ علت نہ پائی جائے گی وہاں نص کا حکم بھی نہ جاری ہوگا۔ جیسا کہ اصول الشاشی کی یہ عبارت اس کی شاہد ہے:

"وأمّا دلالةُ النّص فهي ماعُلِمَ علةً للحكم المنصوص عليه لغةً لااجتهادًا ولا استنباطًا مثالهُ في قوله تعالىٰ "وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا" فالعالم بأوضاع اللّغة يفهم باول السّماع أنّ تحريم التافيف لِدفع الاذى عنهما وحكمُ هذا النوع عموم الحكم المنصوص عليه لعموم علته. ولهٰذا

دلالت النص وہ ہے جو لغت کے اعتبار سے حکم منصوص علیہ کی علت معلوم ہو اور اس میں اجتہاد واستنباط کا دخل نہ ہو۔ اس کی مثال قرآن میں یہ ہے "ماں باپ کو اف تک نہ کہو اور نہ انھیں جھڑکو" عربی زبان کا ماہر اس آیت کو سنتے ہی سمجھ جاتا ہے کہ "اف" کہنے کی حرمت والدین سے اذیت کو دور کرنے کے لیے ہے۔ اس قسم کا حکم حکم منصوص علیہ کا عموم ہے، اس لیے کہ اس کی علت عام

المعنى قلنا بتحريم الضّرب والشتم والاستخدام عن الاب بسبب الاجارة والحبس بسبب الدين او القتل قصاصًا وعلىٰ اعتبار هذا المعنى قيل: يدار الحكم على تلك العلة. قال الامام القاضي ابوزيد رحمه الله تعالىٰ: لوأنّ قوما يعدّون التافيف كرامةً لايحرم عليهم تافيف الأبوين. اه."(۱)

ہے۔ اور اس معنی کے پیش نظر ہم نے کہا کہا کہ والدین کو مارنا، گالی دینا، باپ کو مزدور رکھ کر کام لینا، قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں قید کرنا یا قصاص میں قتل کرنا حرام ہے۔ اور اسی معنی کے اعتبار سے کہا گیا کہ جہاں یہ علت (اذیت رسانی) ہوگی وہیں حکم بھی ہوگا۔ امام قاضی ابوزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اگر کسی قوم میں "اف کہنا" کلمۂ تعظیم ہو تو ان کے لیے ماں باپ کو اف کہنا حرام نہیں ہوگا۔ (م۔ساجد)

قفیز طحان کی ممانعت کی علت یہ ہے کہ کام کے ایک جز کو اجرت مقرر کرنا تقاضائے عقد کے خلاف ہے اور تعامل کی وجہ سے وہ تقاضائے عقد کے موافق ہو گیا۔ لہذا جہاں تعامل ہوگا وہاں قفیز طحان کا حکم نہ جاری ہوگا اور زیر بحث مسئلہ میں تعامل متحقق ہے، پھر جیسا کہ جواب نمبر ایک میں بیان ہوا، ہمارے مسئلۂ دائرہ میں حاجت بھی متحقق ہے اور وہ بھی اس طرح کے مسائل میں مؤثر ہے۔ لہذا کمیشن پر چندہ کی وصولی تعامل عام اور حاجت شرعیہ دونوں کی تاثیر کی وجہ سے ضرور جائز ہوگی۔

جواب (۳) کمیشن پر چندہ کی وصولی کو قفیز طحان کے معنی محظور کے دائرے میں آنے سے بچانے کے لیے اگر بوقت معاہدہ یہ صراحت کردی جائے کہ:

"اجرت وصول کی ہوئی رقم سے نہ دیں گے۔"

تو اجارہ بلا دغدغہ جائز و درست ہوگا اور بعد میں کسی بھی رقم سے اجرت دینی

(۱) اصول الشاشي، ص: ۳۰-۳۱. فصلٌ في متعلقات النّصوص. بحث دلالة النص.

جائز ہوگی۔ یہ طریقہ اختلاف اور ردّ وقدح سے پاک ہے۔

جواب (۴-الف) اگر قاضی شریعت یا اعلم علمائے بلد دیانت دار محصلین کو بہ حیثیت عامل مقرر کردے تو وہ "عامل شرعی" ہوں گے جو مصارف زکاۃ سے ہیں۔

(ب) عامل کا تقرر کر کے اصل منصوص طریقے کو اختیار کرنا زیادہ مناسب تھا مگر آج کے دور میں اس طریقۂ حسنہ کے نفاذ میں کچھ دشواریاں ہیں۔

ان میں سے **ایک دشواری** یہ ہے کہ ہر علاقے میں ماہر فقیہ جو اعلم علمائے بلد، مرجع فتویٰ ہو، موجود نہیں اور جہاں موجود ہیں وہاں بھی عموماً لامرکزیت پائی جاتی ہے۔ زعم علم واحساس برتری کسی لائق فرد پر اجتماع سے مانع ہوتی ہے۔ جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے اور عوام اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ ہماری لامرکزیت اور انتشار وتفریق کا عالم یہ ہے کہ آج تک دار القضا کا نظام ہمارے یہاں جاری نہ ہو سکا، پھر کون کس کو عامل مقرر کرے گا۔ اگر غیر اہل کسی کو عامل مقرر کردے تو وہ نہ عامل ہوگا، نہ اسے زکاۃ وصدقات سے لینے کی اجازت ہوگی اور اگر قضاۃ کے تقرر سے پہلے عامل مقرر کرنے کی اجازت دے دی گئی تو کوئی بعید نہیں کہ کچھ ایسے لوگ بھی یہ کام شروع فرما دیں جو شرعاً اس کے اہل نہ ہوں، پھر تو بہت سے نام کے عامل شرعاً عامل نہ ہوں گے اور نہ ہی انھیں حق المحنت دینے سے زکاۃ ادا ہوگی۔ اور اس طرح مفسدہ کا ایک بڑا دروازہ کھل جائے گا جو شاید آسانی سے بند نہ ہو سکے۔

دوسری دشواری یہ پیش آئے گی کہ عامل کو حق المحنت بہ قدر کفایت ہی دینے کی اجازت ہے جس کا اندازہ حکومت سے ملنے والی تنخواہ سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ عام ملازمین کے لیے بہ قدر کفایت ہی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کمیشن کی سی لامحدود منفعت اس میں نہیں ہوتی اس کے باعث وصولی بہت محدود ہو کر رہ جائے گی۔ کیوں کہ جس شخص کا قدر کفایت مثلاً دس ہزار روپے ماہانہ ہوگا وہ پچیس تیس ہزار روپے وصول کر کے آرام کرے گا، اسے کیا پڑی ہے کہ وہ جاں فشانی کر کے لاکھ، ڈیڑھ لاکھ

وصول کرے کہ آخر جاں فشانی کر کے جو رزق وہ حاصل کرے گا وہی تن آسانی کی صورت میں بھی حاصل ہوگا، اس فکر کا کوئی علاج نہیں۔

الغرض زکاۃ وصدقات کی وصولی کے لیے عامل کا طریقہ اختیار کرنا شرعی نقطۂ نظر سے مناسب زیادہ ہے۔ لیکن اس کا نفاذ دشوار ہے اور نفاذ ہو بھی جائے تو اس سے مدارس کا بھلا بہت مستبعد ہے۔ اس لیے میری نگاہ میں مناسب اور محتاط طریقہ یہ ہے کہ سفرا سے معاہدہ کے وقت یہ کہہ دیا جائے کہ اجرت وصولی کی رقم سے نہ دیں گے۔ اسی میں سلامتی اور مدارس کا خیر ہے۔

جواب (۵) عامل اگر اپنی وصول کردہ زکاۃ وصدقات سے کچھ رقم اپنے طور سے خرچ کرلے تو زکاۃ ادا ہو جائے گی کہ وہ مصارف زکاۃ سے ہے اور اس نے جو کچھ لیا ہے اپنا حق لیا ہے۔

چناں چہ بحر الرائق میں ہے:

"وفی البزازیة: المُصدِق اذا اخذ عمالتهٗ قبل الوجوب أو القاضی استوفی رزقهٗ قبل المدة جاز. والأفضل عدم التعجیل لاحتمال أن لایعیش إلی المدة." اھ.[1]	فتاویٰ بزازیہ میں ہے: عامل کام پورا کرنے سے پہلے اپنا حق المحنت لے لے یا قاضی وقت پورا ہونے سے پہلے اپنا وظیفہ حاصل کرلے، یہ جائز ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ اس میں جلدی نہ کی جائے کیوں کہ ہو سکتا ہے وہ اس وقت تک زندہ ہی نہ ہے۔ (م ساجد)

ایسا ہی ردالمحتار جلد دوم کتاب الزکاۃ باب المصرف میں بھی ہے۔

اور اجیر یا سفیر نے اگر وصول کردہ زکاۃ، صدقات، عطیات سے اپنے طور پر کچھ رقم اپنے مصرف میں خرچ کرلی تو وہ شرعاً غاصب قرار پائے گا کہ یہ اس کی طرف سے امانت میں خیانت اور تعدی ہے جو حرام وگناہ ہے۔ اس پر واجب ہے کہ معطی کو

(۱) بحر الرائق، ص:۲٤۱، ج:۲، باب المصرف.

اتنی رقم واپس کرے، پھر وہ مدرسہ کو دے تو لائے یا اس سے کہے کہ آپ کی رقم مجھ سے صرف ہوگئی آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے پاس سے اتنی رقم آپ کی طرف سے مدرسہ میں جمع کردوں، اگر وہ اجازت دے دے تو ٹھیک، ورنہ اس کی رقم اسے واپس کردے۔

اور اگر اس نے دوبارہ معطی سے اجازت نہ لی، نہ اسے دے کر واپس لیا بلکہ اپنے پاس سے مدرسہ میں جمع کردیا یا اپنی اجرت یا کمیشن میں مجرا کرلیا تو یہ حق اللہ اور حق العبد دونوں میں گرفتار رہے گا۔ حق اللہ میں اس لیے کہ اللہ عزوجل کے حکم کی خلاف ورزی کرکے امانت میں خیانت کی۔ اور حق العبد میں اس لیے کہ بندے کے مال میں تعدی کی اور بغیر اس کی اجازت کے اپنے مصرف میں صرف کیا پھر اسے ادا نہ کیا۔ ہاں! اگر مدرسہ میں جمع کیا تو یہ اس کی طرف سے تبرع ہے جس کا ثواب پائے گا، مگر اس کی وجہ سے حق مسلم ادا نہ ہوگا۔

البتہ یہاں یہ گنجائش ہے کہ صاحب مال یا اس کے ورثہ کا پتہ نہ چلے تو قاضی اسلام یا اعلم علمائے بلد مرجع فتویٰ سے عرض حال کرے اور اس کی اجازت سے مدرسہ میں وہ رقم جمع کردے اور تائب ہوجائے۔ اگر ایسا کرلیا تو تعدی کے وبال سے بچ جائے گا، مگر خرچ کیے ہوئے مال کا تاوان تو اسے بہر حال ادا کرنا پڑے گا۔ اگر دنیا میں نہ ادا کرے گا تو عقبیٰ میں لامحالہ احکم الحاکمین جل وعلا اس سے دلا دے گا۔ اور ظاہر ہے کہ وہاں مال تو ہوگا نہیں اس لیے اس کی نیکیاں ہی صاحب حق کو دلائی جائیں گی اور اگر نیکیاں بھی ختم ہوجائیں تو پھر صاحب حق کے گناہ اس کے سر ڈالے جائیں گے۔

فتاویٰ ہندیہ کتاب الوقف میں ہے:

"فی فتاوىٰ أبی اللیث رحمه الله تعالیٰ: رجلٌ جمع مالاً من النّاس لینفقه فی بناء المسجد فأنفق من تلك الدراهم فی حاجته ثم ردّ بدلها فی نفقة المسجد لایسعه أن یفعل ذلك فان فعل فان عرف صاحب ذلك المال ردّ علیه أوسأله تجدید الاذن فیه وان لم یعرف صاحب المال استأذن الحاكم فیما یستعمله وان تعذّر علیه ذلك رجوت له فی الاستحسان أنْ ینفق مثل ذلك من ماله علی المسجد فیجوز لكن هذا واستئمارُ الحاكمِ یجب أن یكون فی رفع الوبال أما الضمان فواجب. كذا فی الذخیرة.
ویبتني علی هذا مسائل ابتلی بها أهل العلم والصلحاء. منها: العالم اذا سأل للفقراء أشیاء واختلط بعضها ببعض یصیر ضامنا لجمیع ذلك واذا أدّی

فتاویٰ ابو اللیث رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں ہے: ایک آدمی نے مسجد تعمیر کرنے کے لیے لوگوں سے چندہ لیا، پھر اس میں سے کچھ روپے اپنی ضرورت میں خرچ کرلیے اور بعد میں اس کا بدلہ مسجد کے خرچ میں ملا دیا۔ ایسا کرنا ناجائز ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا کردے اور یہ معلوم ہو کہ وہ روپے کس نے دیے تھے تو یہ اس کا تاوان دے یا اس سے دوبارہ اجازت لے کر اتنے روپے مسجد میں دے دے اور اگر یہ معلوم نہ ہو کہ یہ روپے کس نے دیے تھے تو حاکمِ اسلام سے پوچھے اور جہاں وہ کہے، خرچ کرے۔ اور اگر یہ اس کے لیے ناممکن ہو تو وہ اتنے روپے اپنے پاس سے مسجد میں دے دے۔ امید ہے کہ یہ استحساناً اس کے لیے جائز ہوگا۔ لیکن یہ اور حاکم اسلام سے مشورہ کرنا دفعِ وبال کے لیے واجب ہے۔ اور تاوان تو بہر صورت لازم ہے۔ ایسا ہی ''ذخیرہ'' میں ہے۔

اور اس پر بہت سے ایسے مسائل کی بنیاد ہے جن میں علما وصلحا مبتلا ہیں۔ انھیں میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ جب عالم فقرا کے لیے کچھ چیزیں لوگوں سے مانگے، پھر انھیں آپس میں ملا دے تو وہ ان ساری چیزوں کا ضامن ہوگا اور جب فقرا کو دے گا تو اپنے مال

صار مؤديا من مال نفسه ويصير ضامنا لهم ولا يجزيهم عن زكوتهم فيجب أن يستأذن الفقير ليأذن له بالقبض فيصير خالطا ماله بماله كذا في المحيط." اھ.(١)

سے دینے والا قرار پائے گا اور اس سے زکاۃ دینے والے کی زکاۃ ادا نہیں ہوگی۔ لہذا عامل کو (چندہ مانگنے سے پہلے) فقیر سے اجازت لینا ضروری ہے تاکہ وہ قبضہ کرنے کی اجازت دے دے۔ اس صورت میں (اگر ملا دے گا تو) فقیر کے مال کو اسی کے مال میں ملانے والا ہوگا۔ ایسا ہی "محیط" میں ہے۔ (م ساجد)

فقرا کے لیے زکاۃ کی رقم وصول کی اور سب کے مال کو ایک دوسرے سے ملا دیا تو تاوان اس لیے واجب ہوتا ہے کہ ایک کا مال دوسرے کے مال میں ملا دینا ہلاک کرنے کے حکم میں ہوتا ہے اور اس لیے زکاۃ بھی ادا نہیں ہوتی تو جب حقیقتاً کوئی شخص مثلاً سفیر مال زکاۃ کو اپنے مصرف میں خرچ کرلے گا تو یقیناً زکاۃ ادا نہ ہوگی، اور تاوان اس کے ذمہ لازم ہوگا۔

خلاصۂ کلام

(۱) کمیشن مثلاً پچیس یا تیس فی صد پر زکاۃ، صدقات، عطیات کی وصولی کا معاہدہ شرعاً عقد اجارہ کی ایک خاص قسم "اجارہ علی العمل" ہے۔

(۲) اور یہ اجارہ دو وجوہ سے ناجائز و فاسد ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ کام یعنی وصولی اور اجرت کی مقدار مجہول ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ قفیز طحان کے معنی میں ہے اور دونوں ہی وجہیں مفسد اجارہ ہیں۔

(۳) مگر اس زمانے میں کمیشن پر چندے کا عام طور پر تعامل ہو چکا ہے، ساتھ ہی اس کی حاجت بھی متحقق ہے اس وجہ سے کمیشن کی شرط اب عقد اجارہ کے

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، ص:٤٨٠-٤٨١، ج:٢، الباب الثاني عشر في الاوقاف التي يستغنى عنها.

موافق اور اجارہ جائز ہے۔ جیسے $\frac{۱}{۸}$ اجرت پر دلالی اور نصف کپڑے کے بدلے کپڑا بنوانے کی اجازت فقہا نے بوجہ تعامل و حاجت دی ہے۔

(۴) ہاں کمیشن پر وصولی کے لیے ضرورت شرعیہ متحقق نہیں ہے، نہ کبھی پہلے متحقق تھی۔

(۵) بہتر یہ ہے کہ کمیشن پر وصولی کے معاہدہ کے وقت یہ صراحت کر دی جائے کہ شرح کمیشن تو مثلاً وصولی کا بیس فی صد ہوگا، لیکن اجرت وصول کردہ رقم سے نہیں دی جائے گی۔ یہ صورت بالاتفاق جائز ہے اور اس کے جواز کے لیے تعامل و حاجت کی بھی کوئی حاجت نہیں۔

(۶) اس سے بھی مناسب تر صورت یہ تھی کہ قاضی اسلام کے ذریعہ "عامل شرعی" کا تقرر ہو اور وہ یہ خدمت انجام دے۔ مگر اس کے نفاذ میں دو دشواریاں ہیں۔

ایک یہ کہ قضاۃ کی کمی یا عدم تعین یا لامرکزیت کی وجہ سے تمام جگہوں پر عامل شرعی کا تقرر ہر جگہ نہ ہو سکے گا۔ جس کے باعث وہ مبتلاے آثام بھی ہو سکتا ہے۔

دوسرے عامل کا حق المحنت بہ قدر کفایت ہی دینے کی اجازت ہے جو ایک مقررہ تنخواہ کے درجے میں ہے اور اس میں کمیشن کی طرح غیر محدود نفع نہیں ہے۔ اس لیے مدارس کی وصولی سمٹ کر رہ جائے گی اور مدارس سخت خسارہ کے شکار ہوں گے۔ اس لیے اس کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔

(۷) زکاۃ و صدقات در اصل فقرا و مساکین کا حق ہیں اور بوجہ ضرورت شرعیہ مدارس دینیہ میں انھیں صرف کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس لیے سفرا و محصلین کا کمیشن ان کی وصولی کا جائزہ لے کر اس حساب سے مقرر کرنا چاہیے کہ وہ کام کے دنوں میں ان کے اوسط اخراجات کے لیے کفایت کرے کہ ضرورت کا لحاظ ضرورت بھر ہوتا ہے، نیز یہ سفرا کام کے لحاظ سے عاملین کے درجے میں ہوتے ہیں اس کا بھی تقاضا یہی ہے کہ انھیں کمیشن بہ قدر کفایت ملے یا کچھ زیادہ، اس سے بہت

زیادہ کی اجازت نہیں ہوسکتی۔
رمضان المبارک کے موسم میں اخراجات نسبۃً بہت بڑھ جاتے ہیں پھر بھی ایک متوسط درجے کے آدمی کا خرچ دس ہزار روپے سے ہرگز زیادہ نہیں ہوسکتا اور اوسط خرچ تو پانچ، چھ ہزار روپے سے تجاوز نہ کرے گا، اس لیے شرح کمیشن طے کرتے وقت اس کا لحاظ واجب ہے۔

(۸) محصل پر واجب ہے کہ وصول کردہ رقم سے کچھ بھی اپنے استعمال میں نہ لائے۔حتیٰ کہ اپنے کرایے میں بھی صرف نہ کرے، نہ اسے اپنے حق المحنت میں وضع کرے کہ یہ امانت میں خیانت اور مال مسلم میں تعدی ہوگی جس کے باعث وہ حق اللہ وحق العبد میں گرفتار و مستحق عذاب نار ہوگا۔ساتھ ہی اس پر فرض ہوگا کہ صاحب مال کو تاوان دے۔ نیز اسے بتائے کہ اس کی زکاۃ ادا نہیں ہوسکی ہے، وہ ادا کردے یا اسے واپس کردے تاکہ وہ مدرسہ تک پہنچادے یا کم ازکم اس سے یہ اجازت لے کہ یہ اپنے پاس سے اس کی طرف سے جمع کردے۔

(۹) جس نے اس طرح کی رقم سے کچھ بھی خرچ کیا ہو اور مالک کو اس کا تاوان نہ دے، نہ بہ طور مذکور اس سے اجازت لے تو قیامت کے دن اس کے باعث وہ عنداللہ ماخوذ ہوگا۔ اس لیے ایسے شخص پر واجب ہے کہ دنیا میں ہی ارباب اموال اور وہ نہ ہوں تو ان کے ورثہ سے اپنا معاملہ صاف کرالے تاکہ وہ اپنی زکاۃ وصدقۂ فطر ادا کرلیں اور یہ مواخذۂ اخروی سے محفوظ ہوجائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبــــــــــــــــــــہ محمد نظام الدین الرضوی
خادم الافتاء بدار العلوم الاشرفیة مصباح العلوم
مبارکفور

مصنف کی تصانیف

۱۔ عصمت انبیا (سیرت انبیا کا اہم ترین باب)

۲۔ جدید بینک کاری اور اسلام (چاروں مذاہب کی روشنی میں دنیا کے بینکوں کے احکام)

۳۔ شیر بازار کے مسائل (اپنے موضوع پر اولین تحقیقی کتاب)

۴۔ اسلام کے سات بنیادی اصول (جن کی بنیاد پر اسلام ہر دور میں عالم انسانی کی رہنمائی کرتا ہے)

۵۔ لاؤڈ اسپیکر کا شرعی حکم (ایک اہم تحقیق)

۶۔ مشینی ذبیحہ، مذاہب اربعہ کی روشنی میں

۷۔ تحصیل صدقات پر کمیشن کا حکم

۸۔ دو ملکوں کی کرنسیوں کا تبادلہ و حوالہ (جن کے احکام سے آگاہی آج سب کے لئے ضروری)

۹۔ دکانوں، مکانوں کے دوامی اجارہ، پٹہ اور پگڑی کے مسائل

۱۰۔ خاندانی منصوبہ بندی اور اسلام

۱۱۔ انسانی خون سے علاج کا شرعی حکم

۱۲۔ ایک نشست میں تین طلاق کا شرعی حکم

۱۳۔ خسر، بہو کے رشتے کا احترام اسلام کی نگاہ میں

۱۴۔ فقہ حنفی کے چند مسائل پر شبہات کا ازالہ

۱۵۔ عظمت والدین

۱۶۔ مبارک راتیں

MAKTABA BURHANE MILLAT
Ashrafia Mubarakpur
Distt. Azamgarh (U.P.)

RS 30.00